ماہنامہ

اشراق

لاہور

دسمبر ۲۰۱۸ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

"...واقعہ یہ ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے کچھ باتیں نقل ہو کر سامنے آ گئی ہیں۔ یعنی اِن کی نسبت اُس ہستی کے ساتھ ہے جو دین کا تنہا ماخذ ہے، جس کا علم بے خطا ہے اور جس کے بارے میں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ گفتۂ او گفتۂ اللہ بود۔ مزید یہ کہ اِن باتوں کے الفاظ، اِن کا علم، اِن کی حکمت، اِن کی شان کلام، اِن کی عالمانہ بلندی، اِن کی قرآن و سنت سے موافقت، سب گواہی دے رہے ہیں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہو سکتی ہیں۔ اب کیا اِنھیں صرف اِس لیے رد کر دیا جائے کہ یہ ہم تک انفرادی ذرائع سے پہنچی ہیں؟ ہر سلیم الفطرت انسان کہے گا کہ ایسا کرنا علم و عقل کے صریحاً خلاف ہوگا۔"

—— شذرات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ وتلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول وفروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق وتنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر واشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان واخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم وتعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو ونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما وصالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر وعبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگی قلب ونظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ماہنامہ
اشراق
لاہور
جلد ۳۰ شمارہ ۱۲ دسمبر ۲۰۱۸ء ربیع الاول/ ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 30روپے
سالانہ 300روپے
رجسٹرڈ 700روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)
بیرون ملک
سالانہ 30ڈالر

فہرست

شذرات

"الرسالہ" میں ماخذ دین کی بحث: جناب جاوید احمد غامدی سے ایک گفتگو (۲) — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات

البیان: الحج ۲۲: ۱-۴ (۱) — جاوید احمد غامدی — ۹

معارف نبوی

اخلاقیات (۳) — جاوید احمد غامدی/ محمد حسن الیاس — ۱۳

سیر و سوانح

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا — محمد وسیم اختر مفتی — ۲۰

مقالات

البیان: خصائص و امتیازات (۲) — رضوان اللہ — ۳۴

نقد و نظر

نوح اور ابراہیم: نقدِ احباب کا جائزہ — ساجد حمید — ۶۶

اشاریہ

اشاریہ ماہنامہ "اشراق" ۲۰۱۸ء — نعیم احمد — ۸۹

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شذرات

سید منظور الحسن

’’الرسالہ‘‘ میں ماخذ دین کی بحث

جناب جاوید احمد غامدی سے ایک گفتگو

(۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[یہ سوال و جواب استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے ساتھ میری ایک گفتگو سے ماخوذ ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں امام شافعی کی کتاب ’’الرسالہ‘‘ کی تدریس کے دوران میں ایک مبتدی طالب علم کے اشکالات کو رفع کرنے کے لیے استاذ گرامی نے جو گفتگو فرمائی، اسے میں نے اپنے فہم کے لحاظ سے مرتب کیا ہے۔ امید ہے کہ ماخذ دین کی بحث میں دل چسپی رکھنے والے طالب علموں کے لیے یہ افادیت کا باعث ہو گی۔]

سوال: گذشتہ نشست میں آپ نے جو گفتگو فرمائی تھی، اس سے ماخذ دین کی بحث کو سمجھنے میں بہت مدد ملی ہے۔ یہ بھی واضح ہوا ہے کہ اخبار آحاد کے معاملے کو ہمارے جلیل القدر علما کیسے دیکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک خبر واحد کے محفوف بالقرائن ہو کر درجۂ اطمینان کو پہنچنے کا تعلق ہے تو اس پر ذہن مطمئن نہیں ہو سکا۔ سوال یہ ہے کہ عقلی اطمینان کے بغیر محض نفسیاتی اطمینان کی بنا پر کیسے کسی بات کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ یعنی ہمارے اہل علم سے اس بات کا صدور کیسے ہوا ہے کہ ظنی کو قطعی کے متوازی، حتیٰ کہ اس پر حاکم سمجھ لیا گیا ہے؟ پھر ہمارے ائمہ کے زمانے تک علم حدیث باقاعدہ سائنس بھی نہیں بنا تھا۔ تحقیق کے، تدلیس کے، وضع کے، روایت بالمعنیٰ کے اور تناقض وغیرہ کے مسائل غیر معمولی تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے محض قرائن

اور نفسیاتی اطمینان کی بنیاد پر کسی خبر واحد کو علماً یا عملاً درجۂ یقین تک پہنچا دینا کیسے ممکن ہوا ہے؟

جواب: اگر آپ اصل واقعے سے صرف نظر کریں گے تو بات کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ واقعہ یہ ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے کچھ باتیں نقل ہو کر سامنے آ گئی ہیں۔ یعنی اِن کی نسبت اُس ہستی کے ساتھ ہے جو دین کا تنہا ماخذ ہے، جس کا علم بے خطا ہے اور جس کے بارے میں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ گفتۂ او گفتۂ اللہ بود۔ مزید یہ کہ اِن باتوں کے الفاظ، اِن کا علم، اِن کی حکمت، اِن کی شان کلام، اِن کی عالمانہ بلندی، اِن کی قرآن وسنت سے موافقت، سب گواہی دے رہے ہیں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہو سکتی ہیں۔ اب کیا اِنھیں صرف اِس لیے رد کر دیا جائے کہ یہ ہم تک انفرادی ذرائع سے پہنچی ہیں؟ ہر سلیم الفطرت انسان کہے گا کہ ایسا کرنا علم وعقل کے صریحاً خلاف ہو گا۔

انسان کے پاس جب کسی مسئلے کا واضح حل نہیں ہوتا یا وہ اس کا حل نہیں کر پاتا تو اس کے پاس دو راستے ہوتے ہیں: ایک یہ کہ وہ رد وقبول کے سادہ منطقی اصول پر کھڑا ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنی نفسیاتی قوت کے سہارے کھڑا ہو کر فیصلہ کرے۔ زیادہ تر لوگ یہی دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اس نفسیاتی قوت کے پیچھے بالعموم وہ دلائل ہوتے ہیں جن کے لیے ہمارے ہاں محفوف بالقرائن کی تعبیر اختیار کی جاتی تھی۔ آپ دیکھیے کہ بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ جنھیں عدالت میں ثابت نہیں کیا جا سکتا، مگر ان کے وقوع کا ہمیں پورا یقین ہوتا ہے۔ یعنی بے شمار معاملات میں ہم اپنے نفسیاتی ایقان کی بنیاد پر فیصلہ کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارا یہ فیصلہ حقیقت کے اعتبار سے غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ لیکن، جب ہم یہ فیصلہ کر رہے ہوتے ہیں تو تردد کے بغیر اور صحت کے یقین کے ساتھ کر رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً جب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کرنے کی روایتیں پڑھتا ہوں تو سرشار ہو جاتا ہوں۔ کوئی ذہنی تردد پیدا ہی نہیں ہوتا، وہ اگر مستند نہ بھی ہوں، تب بھی میری نفسیات، میرا ضمیر اور میرے علم وعقل پکار اٹھتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی وضو کیا ہو گا۔

تاہم، یہ بھی ذہن نشین رکھیے کہ نفسیاتی اطمینان دو دھاری تلوار ہے۔ بعض اوقات یہ علم کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ عقلی استدلال وہ اطمینان نہیں بخشتا جو نفسیاتی اطمینان بخشتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سابقہ علم کا بھی جائزہ لینا چاہیے اور اپنے ذہن کو بھی ٹٹولتے رہنا چاہیے۔

اس نفسیاتی ایقان کی مثالیں اگر آپ، مثلاً مولانا مودودی صاحب کے ہاں دیکھنا چاہیں تو دو جگہوں کا مطالعہ باعث بصیرت ہو گا:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۔ ''رسائل ومسائل''، جلد۳ میں ہے کہ کسی نے ان سے یہ سوال کیا ہے کہ قراءتوں کے اختلاف کی موجودگی میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کے کسی شوشے میں بھی تبدیلی نہیں ہوئی؟ مولانا مودودی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قرآن ابتدا میں نقطوں اور اعراب کے بغیر تھا۔اس صورت میں ایک آیت کے کئی کئی معنی ہو سکتے اور معنوی اختلافات کا دائرہ بہت وسیع ہوسکتا تھا، مگر آپ اس کو خدا کی رحمت سمجھیے کہ اس نے چند قراءتیں متعین کر کے ان اختلافات کو انتہائی محدود کر دیا ہے۔

۲۔ ''تفہیم القرآن'' میں رجم کی بحث میں انھوں نے جو دو تین پیراگراف لکھے ہیں، انھیں بھی پڑھ لیجیے۔

یعنی جب ایک چیز کو آپ بنیادی طور پر ٹھیک مان لیتے ہیں اور اس کے بارے میں فی الجملہ مطمئن ہو جاتے ہیں تو اس کے بعد اگر کہیں جھول یا خلا نظر بھی آئیں تو آپ انھیں اپنے یقین کی روشنی میں رد کر دیتے ہیں۔آپ کا جو ذہنی اسٹرکچر بنا ہے، اس میں یہ رد کرنا بالکل بجا ہوتا ہے۔انسانی نفسیات ایسے ہی کام کرتی ہے۔

میں ایک طویل عرصے تک سورۂ نحل کی اس آیت کو جس میں اللہ نے رسول اللہ کو تبیین کا اختیار دیا ہے[۱]، امام شافعی کے ہاں، شاطبی کے ہاں، آمدی کے ہاں، مودودی صاحب کے ہاں پڑھتا رہا، مگر کوئی تردد نہیں ہوا، بلکہ میں نے اس آیت کو بنیاد بنا کر پورے زور کے ساتھ ایک مضمون بھی لکھ دیا۔لیکن جب قرآن میں رکھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آیت کا تو یہ مطلب ہی نہیں ہے۔اصل میں دیکھا ہی نہیں پچیس تیس سال تک۔اتنے بڑے لوگوں کی عظمت کے سحر نے یہ خیال ہی پیدا نہیں ہونے دیا کہ اس کے فہم میں ان سے غلطی ہوسکتی ہے۔ایسے موقع پر انسان کو اپنی عاجزی اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے، لیکن انسان ایسا ہی ہے۔اس طرح کی اور بے شمار چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے اندر بعض اوقات کسی غلطی پر بھی اعتماد پیدا کر دیتی ہیں، کوئی دوسرا توجہ دلاتا ہے تو پھر راستہ کھلتا ہے۔

اس کو دوسرے زاویے سے بھی دیکھ لیجیے۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میں ایک آیت کے معنی پر بالکل مطمئن ہوتا ہوں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہوتا کہ میں سوال کرنے والے کو یہ کیسے بتاؤں کہ اس کے معنی یہ ہیں۔اصل میں میں اپنے قرآن اور زبان کے علم کی بنیاد پر وجدانی طور پر مطمئن ہو گیا ہوتا ہوں اور اس پر مجھے کوئی ادنیٰ تردد بھی نہیں ہوتا، لیکن میں اسے سمجھا اس لیے نہیں پاتا کہ میرا اطمینان ابھی بیان کی منطق میں نہیں ڈھلا ہوتا۔

اب دیکھیے، امام شافعی کیسے اپروچ کرتے ہیں۔وہ اس کو مانتے ہی نہیں کہ کچھ ہوا ہے۔ان کے نزدیک اخبار آحاد نے نہ نسخ کیا ہے، نہ اضافہ کیا ہے، نہ تبدیلی کی ہے۔وہ پورا اصرار کرتے ہیں کہ یہ قرآن کا بیان ہیں۔ —— اسی

۱؎ ' وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ ' (۱۶:۴۴)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مقدمے کو بعد میں ان کے شاگرد امام احمد بن حنبل نے بھی اختیار کر لیا۔ ——— اب جب آپ ان سے پوچھیں گے کہ یہ بیان کیسے ہیں تو وہ آپ کو آیات قرآنی کی کچھ اسٹیبلش مثالیں دے کر کہیں گے کہ جب آپ ان آیات کو بیان مان رہے ہیں تو اخبار آحاد کو کیوں نہیں مان رہے۔ ''الرسالہ'' کی اصل بحث یہی ہے۔ امام شاطبی نے بھی جب اس مسئلے کو لیا ہے اور اخبار آحاد سے حاصل ہونے والے علم کو قرآن مجید سے ماخوذ بتایا ہے تو اصل میں انھوں نے کم و بیش شافعی زاویۂ استدلال ہی کو اختیار کیا ہے۔

امام شافعی کے استدلال کا تانا بانا بہت سادہ ہے۔ اس کو سمجھنا چاہیں تو گویا وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے جب سورۂ نور میں پڑھا کہ 'اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ[۲]'، (زانی عورت ہو یا زانی مرد، تو دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو) تو میں نے سمجھا کہ زانی مرد و عورت کی سزا سو کوڑے ہے۔ لیکن جب میں نے سورۂ نساء (۴: ۲۵) کو دیکھا تو پتا چلا کہ یہ حکم لونڈیوں کے لیے تو نہیں ہے، اب میرا یہ اعتماد ختم ہو گیا کہ میں حتمی حکم لگاؤں۔ چنانچہ جب ایک روایت نے یہ بتایا کہ یہ حکم شادی شدہ کے لیے بھی نہیں ہے تو میں اس کا کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ لہٰذا اگر سورۂ نساء کی لونڈیوں کو استثنا دینے والی آیت سورۂ نور کے حکم کا بیان ہو سکتی ہے تو شادی شدہ زانی کو رجم کرنے والی روایت کیوں اس کا بیان نہیں ہو سکتی!

احناف نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ——— واضح رہے کہ احناف زیادہ عقلی ہیں، یعنی وہ منطقی اور عقلی مقدمات کے بارے میں زیادہ حساس ہیں۔ ——— انھوں نے کہا کہ جس کو آپ بیان قرار دے رہے ہیں، اس کو بیان قرار دینے کو تو عقل قبول نہیں کرتی۔ یہ اصل میں نسخ ہے جسے آپ بیان سے تعبیر کر رہے ہیں۔ تاہم، ہم حدیث کی اس حیثیت کو قبول کرتے ہیں کہ وہ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ لیکن ہم اس نسخ کو فلاں موقع پر مانتے ہیں اور فلاں موقع پر نہیں مانتے۔ مانتے وہاں ہیں جہاں وہ خبر متواتر یا خبر مشہور سے ہوتا ہے، کیونکہ پھر وہ یقین کے ہم پلہ ہو جاتا ہے اور جہاں اخبار آحاد کے ذریعے سے ہو تو ہم اسے نہیں مانتے، کیونکہ اس صورت میں اس کی حیثیت یقین کے مقابلے میں ظن کی ہوتی ہے۔ اس پر میں نے ایک مرتبہ تبصرہ کیا تھا کہ اصول میں امام شافعی کی بات ٹھیک ہے اور عمل میں احناف کی۔

اس سے واضح ہوا کہ اصحاب علم کے استدلال کی ایک ترتیب ہوتی ہے۔ وہ ایک لائن میں آگے بڑھتا ہے۔ ابتدا بالعموم نفسیاتی اطمینان ہی سے ہوا کرتی ہے اور پھر جب دلائل فراہم ہو جائیں تو عقلی اطمینان بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

---

۲ ۲۴: ۲۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بہرحال ہر صاحب علم کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اسے اپنے علم کے بارے میں نفسیاتی اطمینان بھی حاصل ہو اور عقلی اطمینان بھی۔ یعنی ہمیں مسلسل تگ و دو کرتے رہنا چاہیے کہ ہمارا نفسیاتی اطمینان اور ہمارا عقلی اطمینان، دونوں ایک پیج پر آ جائیں۔ یہ ایک جدوجہد ہے۔ اس میں انسان کو اتنا دیانت دار ہونا چاہیے کہ اگر کسی جگہ نفسیاتی اطمینان عقلی اطمینان میں نہیں ڈھلا تو وہاں اس فرق کو واضح کر دینا چاہیے۔ یہ چیز دوسروں کو مہمیز دے گی اور وہ بھی علم کے سفر میں آپ کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآنیات

البیان
جاوید احمد غامدی

الحج - المؤمنون

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع انذار و بشارت ہے جو پچھلی سورتوں سے چلا آ رہا ہے۔ پہلی سورہ میں قریش مکہ کو، خاص کر حرم کی تولیت کے حوالے سے آخری انذار و تنبیہ اور دوسری میں اُن کے لیے اُسی انذار و تنبیہ کے نتائج کی وضاحت ہے جس میں ایمان والوں کی کامیابی کا مضمون بہت نمایاں ہو گیا ہے۔

دونوں سورتوں میں خطاب اصلاً قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۂ حج کی چند آیات، البتہ مدنی ہیں جو اُس اقدام کی وضاحت کے لیے سورہ کا حصہ بنا دی گئی ہیں جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد خدا کا فیصلہ قریش مکہ کے لیے ظاہر ہو جائے گا۔

سورة الحج

(۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ اِنَّ زَلۡزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱﴾ یَوۡمَ
تَرَوۡنَہَا تَذۡہَلُ کُلُّ مُرۡضِعَۃٍ عَمَّاۤ اَرۡضَعَتۡ وَ تَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَہَا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

لوگو،[۱] اپنے پروردگار سے ڈرو۔[۲] حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا بھونچال بڑی ہی ہول ناک چیز ہے۔ تم جس دن اُس کو دیکھو گے، ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل

۱۔ یہ لفظ اگرچہ عام ہے، لیکن اِس سے مراد وہی متمردین قریش ہیں جو قیامت کو جھٹلاتے اور عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے۔

۲۔ یعنی اُس کے مقابلے میں سرکشی اختیار نہ کرو، اِس لیے کہ اُس کا عذاب پناہ مانگنے کی چیز ہے، وہ مطالبہ کرنے کی چیز نہیں ہے۔

وَ تَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی وَ لٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ﴿۲﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ یَتَّبِعُ کُلَّ شَیْطٰنٍ مَّرِیْدٍ﴿۳﴾ کُتِبَ عَلَیْہِ

ڈال دے گی، اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے، حالاں کہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہو گا۔[۳] ۱-۲

اِدھر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُن میں ایسے (احمق) بھی ہیں[۴] جو بغیر کسی علم کے[۵] خدا کے بارے میں جھگڑتے[۶] اور ہر سرکش شیطان[۷] کی پیروی کرنے لگتے ہیں، جس کی نسبت لکھ دیا گیا ہے[۸] کہ جو اُس

۳؎ آیت میں مخاطبین کے لیے ایک جگہ جمع اور دوسری جگہ واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ہم دوسری جگہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جمع کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا جائے تو اُس میں مخاطبین کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مراد ہوتا ہے اور کلام میں جمع کے بالمقابل زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے۔

۴؎ 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ' کا یہ اسلوب تحسین اور تقبیح، دونوں کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ تقبیح کے لیے ہے۔ لفظ 'احمق' کے اضافے سے ہم نے اِسی کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۵؎ یعنی عقل و فطرت، علم و استدلال اور کتاب الٰہی کی کسی شہادت کے بغیر ہی مناظرے اور مجادلے کے لیے آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... اِس طرح کے لوگ کسی معاشرے میں بھی تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہوتے، بلکہ اِن کا ایک خاص طائفہ ہی ہوتا ہے۔ اِن کا علم بھی بس سنی سنائی اور رٹی رٹائی باتوں پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن زبان درازی میں طاق اور لاف زنی میں مشاق ہوتے ہیں، اِس وجہ سے شاطر لوگوں کے ایجنٹ بن کر بے چارے سادہ لوح عوام کو گم راہ کرنے کی خدمت خوب انجام دیتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۲۰۸)

۶؎ یہ اُس جھگڑے کا ذکر ہے جو وہ خدا کی توحید اور اُس کے حضور میں جواب دہی کے متعلق پیدا کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ کسی طرح باور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ قیامت برپا ہو گی اور بالفرض ہو گی تو اُنھیں تنہا خدا سے معاملہ پڑے گا اور اُن کے شرکا و شفعا وہاں اُن کے کام نہ آئیں گے۔

۷؎ یعنی خواہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

۸؎ یہ اُس مہلت کی طرف اشارہ ہے جو خدا نے شیطان کو دے رکھی ہے اور اِس طرح گویا اُس کے لیے طے

اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۴﴾

کو دوست بنائے گا تو یوں ہے کہ اُس کو وہ گم راہ کر دے گا اور اُس کو دوزخ کے عذاب میں پہنچائے گا۔۳-۴

کر دیا ہے کہ قیامت تک وہ یہی خدمت انجام دیتا رہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معارف نبوی

جاوید احمد غامدی

تحقیق و تخریج: محمد حسن الیاس

اخلاقیات

(۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

—— ۱ ——

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ،[۱] أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”لَا يَمْنَعُ جَارٌ جَارَهُ أَنْ يَّغْرِزَ خَشَبَهُ فِيْ جِدَارِهِ“، ثُمَّ يَقُوْلُ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: مَا لِيْ أَرَاكُمْ عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ، وَاللّٰهِ لَأَرْمِيَنَّ بِهَا بَيْنَ أَكْتَافِكُمْ.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص پڑوسی کو اپنی دیوار میں کھونٹی گاڑنے سے نہ روکے۔[۱] ابو ہریرہ یہ روایت سناتے، پھر کہتے تھے: کیا وجہ ہے، میں دیکھتا ہوں کہ تم اِس سے منہ پھیرے ہوئے ہو؟[۲] خدا کی قسم، میں وہی کھونٹی[۳] تمھارے کندھوں کے درمیان گاڑ دوں گا۔[۴]

۱۔ پڑوسی کے معاملے میں جو رویہ ہر بندۂ مومن کو اختیار کرنا چاہیے، یہ اُسی کے ایک پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ساتھ ساتھ رہتے ہوئے کئی ضرورتیں ایک دوسرے سے متعلق ہو جاتی ہیں، اُنھی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دیوار مشترک ہوتی ہے اور کسی کو اُس میں کھونٹی گاڑنے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِس سے روکنا نہیں چاہیے، بلکہ اِس طرح کی تمام ضرورتوں کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے، اِس لیے کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا یہی تقاضا ہے۔

۲۔ مطلب یہ ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سناتا ہوں تو تمھیں باور نہیں آتا کہ آپ نے یہ فرمایا ہوگا، لہٰذا اُس پر عمل کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

۳۔ یعنی جس کے بارے میں ہدایت فرمائی گئی تھی کہ اُس کو گاڑنے سے نہ روکا جائے۔

۴۔ یہ زجر و توبیخ کا جملہ ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اِس کے بعد تم اِسی کے مستحق ہو کہ وہ کھونٹی تمھارے کندھوں کے درمیان گاڑ دی جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۲۲۹۵ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل کتب میں نقل ہوئی ہے:

موطا، امام مالک، رقم ۱۴۰۷۔ مسند شافعی، رقم ۱۰۱۶۔ مسند الحمیدی، رقم ۱۰۳۰، ۱۰۳۰۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۲۴۳۳، ۲۳۴۳۲، ۳۵۶۱۸۔ مسند احمد، رقم ۶۹۷۸، ۱۰۲۰۷، ۵۱۳، ۸۹۸۹، ۹۵۵۶، ۹۷۵۰۔ صحیح مسلم، رقم ۳۰۲۷۔ سنن ترمذی، رقم ۱۲۶۹۔ سنن ابوداؤد، رقم ۳۱۵۲۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۲۳۲۸۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۶۲۱۴، ۶۲۷۴۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۴۴۱۷، ۴۴۱۸، ۴۴۱۹، ۴۴۲۰۔ مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۲۰۲۱، ۲۰۲۲، ۲۰۲۳، ۲۰۲۴، ۲۰۲۵، ۲۰۲۶۔ صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۰۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۲۳۸۷، ۲۶۹۱، ۲۸۲۷، ۸۱۸۷۔ مسند الشامیین، طبرانی، رقم ۳۶۳۔ سنن دارقطنی، رقم ۳۹۸۷۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۰۵۱۹، ۱۰۵۲۱، ۱۰۹۸۲، ۱۰۹۸۳۔ معرفۃ السنن والآثار، رقم ۳۲۰۸، ۳۲۸۹، ۳۲۹۰۔ السنن الصغریٰ، بیہقی، رقم ۹۵۸، ۱۰۵۱۶، ۱۰۵۱۷، ۱۰۵۱۸۔

۲

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ،[۱] عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”مَا نَقَصَتْ

صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا[2]، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ".

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ دینے سے کوئی مال کبھی کم نہیں ہوتا[1]، جو بندہ معاف کردے، اللہ اُس کی عزت ہی بڑھاتا ہے، اور جو اللہ کی خاطر عاجزی اختیار کرے، اُس کا صلہ یہی ہے کہ اللہ اُس کا درجہ بلند کردے۔

۱۔ اللہ کی راہ میں انفاق پر ابھارنے کے لیے یہ تسلی اور بشارت کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس سے جو کمی ہوگی، اللہ یہاں بھی کسی نہ کسی طریقے سے اُس کو پورا کردیں گے اور آخرت میں بھی کئی گنا اضافے کے ساتھ اُس کا صلہ دیں گے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۴۶۹۵ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل مصادر میں نقل ہوئی ہے:

سنن ترمذی، رقم ۱۹۴۸۔ سنن دارمی، رقم ۱۶۳۲۔ مسند احمد، رقم ۷۰۳۲، ۸۸۰۳۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۲۲۷۶۔ صحیح ابن حبان، رقم ۳۳۳۰۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۷۲۲۰، ۱۹۴۲۶۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۶۴۲۲۔ مسند ابن زیدان، رقم ۴۹۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۵۰۹۲۔

۲۔ مسند احمد، رقم ۷۰۳۲ میں یہ بات اِس اسلوب میں نقل ہوئی ہے: 'وَلَا عَفَا رَجُلٌ عَنْ مَظْلَمَةٍ، إِلَّا زَادَهُ اللّٰهُ عِزًّا' ''اور جو آدمی کسی بے انصافی سے درگذر کرلے، اللہ اُس کی عزت ہی میں اضافہ فرماتا ہے''۔

۳

عَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ[1]، أَنَّهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اللّٰهَ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ وَلَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى

أَحَدٍ".

عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو، یہاں تک کہ نہ تم میں سے کوئی کسی پر زیادتی کرے اور نہ کسی پر اپنی بڑائی کی دھونس جمانے کی کوشش کرے۔

متن کے حواشی

ا۔ اِس روایت کا متن سنن ابی داوٗد، رقم ۴۲۵۲ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت اِن کتابوں میں نقل ہوئی ہے: الادب المفرد، رقم ۴۲۳۔ مسند بزار، رقم ۲۹۷۷۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۴۴۲۳۔ شعب الایمان، بیہقی، رقم ۶۱۶۱۔

عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ کے علاوہ یہ روایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی نقل ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو: سنن ابن ماجہ، رقم ۴۲۱۴ اور الادب المفرد، بخاری، رقم ۴۲۶۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۴

أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "الْفَخْرُ وَالْخُيَلَاءُ فِي الْفَدَّادِيْنَ أَهْلِ الْوَبَرِ، وَالسَّكِيْنَةُ فِيْ أَهْلِ الْغَنَمِ".

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ غرور و تکبر خیمے والوں میں ہے جو چلّا کر بولتے ہیں اور وقار و اطمینان بھیڑ بکری والوں میں ہے۔[1]

ا۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگوں کا رہن سہن، ماحول اور پیشے اُن کے اخلاق اور رویوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اِس لیے محتاط رہنا چاہیے کہ آدمی اِن چیزوں کے برے اثرات سے اپنے آپ کو، جس حد تک ممکن ہو، بچا کر رکھے۔

متن کے حواشی

ا۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۸۰ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت مسند احمد، رقم ۸۰۴۱ اور مستدرک حاکم، رقم ۱۵۷ میں نقل ہوئی ہے۔

۲۔ مسند احمد، رقم ۸۰۴۲ میں 'الْفَدَّادِينَ أَهْلِ الْوَبَرِ' کے بجاے 'الْخُيَلَاءُ وَالْفَخْرُ فِي أَهْلِ الْخَيْلِ وَالْإِبِلِ' کے الفاظ ہیں، یعنی تکبر اور فخر تو گھوڑوں اور اونٹوں والے لوگوں میں ہوتا ہے۔

—— ۵ ——

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ،[1] قَالَا: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الْعِزُّ[2] إِزَارُهُ، وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَاؤُهُ، [يَقُولُ اللّٰهُ[3]] فَمَنْ يُنَازِعُنِي عَذَّبْتُهُ".[4]

ابوسعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عزت پروردگار کی ازار اور بزرگی اُس کی ردا ہے۔[1] اللہ فرماتا ہے: جو شخص اِن چیزوں کو مجھ سے لینے کے لیے جھگڑے گا، میں اُس کو عذاب دوں گا۔

ا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں خدا ہی کے شایان شان ہیں، وہی اِن کو اوڑھنے اور پہننے کا حق رکھتا ہے۔ بندوں کی شان عجز و انکسار ہے اور اُن کو ہمیشہ اِسے ہی اپنی ازار اور ردا بنانا چاہیے۔

متن کے حواشی

ا۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۶۷۵۸ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی ابوسعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما ہیں۔ اِن صحابہ سے یہ روایت درج ذیل مصادر میں نقل ہوئی ہے:

مسند ابو داؤد طیالسی، رقم ۲۴۹۹۔ مسند الحمیدی، رقم ۱۰۹۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۵۹۹۶۔ مسند اسحاق، رقم ۲۳۸۔ مسند احمد، رقم ۷۲۸۰، ۸۶۹۵، ۹۱۵۴، ۹۳۰۳، ۹۴۹۰۔ الادب المفرد، رقم ۵۴۹۔ سنن ابو داؤد، رقم ۳۵۶۹۔

سنن ابن ماجہ، رقم ۴۱۷۲۔ صحیح ابن حبان، رقم ۳۳۲، ۵۷۸۸۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۴۸۳۵، ۹۴۸۶۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۸۹۔ مسند شہاب، رقم ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱۔ معرفۃ السنن والآثار، رقم ۵۲۸۴۔ شعب الایمان، بیہقی، رقم ۷۶۷۴۔

۲۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۴۱۷۲۔

۳۔ سنن ابی داؤد، رقم ۳۵۶۹ میں 'الْعِزّ' کے بجاے 'وَالْعَظَمَةُ' نقل ہوا ہے، دونوں سے ایک ہی مدعا کا اظہار مقصود ہے۔

۴۔ سنن ابی داؤد میں یہ بات اِس اسلوب میں نقل ہوئی ہے: 'فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا، قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ' ''جو اِن میں سے کسی چیز کو بھی، مجھ سے چھیننا چاہے گا، میں اُسے جہنم میں ڈال دوں گا''۔

المصادر والمراجع

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ابن حبان، أبو حاتم بن حبان. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**. ط٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حجر، على بن حجر أبو الفضل العسقلاني. (١٣٧٩هـ). **فتح الباري شرح صحيح البخاري**. (د.ط). تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار المعرفة.

ابن قانع. (١٤١٨هـ/١٩٩٨م). **المعجم الصحابة**. ط١. تحقيق:حمدي محمد. مكة مكرمة: نزار مصطفىٰ الباز.

ابن ماجة، ابن ماجة القزويني. (د.ت). **سنن ابن ماجة**. ط١. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار الفكر.

ابن منظور، محمد بن مكرم بن الأفريقي. (د.ت). **لسان العرب**. ط١. بيروت: دار صادر.

أبو نعيم ، (د.ت). **معرفة الصحابه**. ط١. تحقيق: مسعد السعدني. بيروت: دارالكتاب العلمية.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (د.ت). **مسند أحمد بن حنبل**. ط١. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البخاري، محمد بن إسماعيل. (١٤٠٧هـ/ ١٩٨٧م). **الجامع الصحيح**. ط٣. تحقيق:

مصطفٰی ديب البغا. بيروت: دار ابن كثير.

بدر الدين العيني. **عمدة القاري شرح صحيح البخاري**. (د.ط). بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البيهقي، أحمد بن الحسين البيهقي. (١٤١٤هـ/١٩٩٤م). **السنن الكبرٰى**. ط١. تحقيق: محمد عبد القادر عطاء. مكة المكرمة: مكتبة دار الباز.

السيوطي، جلال الدين السيوطي. (١٤١٦هـ / ١٩٩٦م). **الديباج على صحيح مسلم بن الحجاج**. ط ١. تحقيق: أبو إسحٰق الحويني الأثري. السعودية: دار ابن عفان للنشر والتوزيع.

الشاشي، الهيثم بن كليب. (١٤١٠هـ). **مسند الشاشي**. ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين اللّٰه. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

محمد القضاعي الكلبي المزي. (١٤٠٠هـ/١٩٨٠م). **تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط١. تحقيق: بشار عواد معروف. بيروت: مؤسسة الرسالة.

مسلم، مسلم بن الحجاج. (د.ت). **صحيح المسلم**. ط١. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **السنن الصغرٰى**. ط٢. تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة. حلب: مكتب المطبوعات الإسلامية.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤١١هـ/١٩٩١م). **السنن الكبرٰى**. ط١. تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت اسماء بنت عمیس کے اجداد کا تعلق بنوخثعم (خثعم بن انمار) سے تھا۔ یمن سے ہجرت کر کے وہ مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ حضرت اسماء مکہ ہی میں پیدا ہوئیں۔ ابن سعد نے انھیں مکہ میں نو وارد (یا اجنبی) مسلمان خواتین کے طبقے میں شامل کیا ہے۔ معد (معبد: ابن کثیر) بن حارث بن تیم (یا معد بن تیم بن حارث) ان کے دادا تھے۔ ابن اسحٰق اور ابن عبدالبر نے دوسری روایت کے مطابق ان کے دادا کا نام مالک بن نعمان بن کعب لکھا ہے۔ حضرت اسماء کی والدہ ہند (یا خولہ) بنت عوف بنوجرش سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی اہلیہ حضرت سلمیٰ بنت عمیس اور حضرت عبداللہ بن کعب کی اہلیہ حضرت سلامہ بنت عمیس حضرت اسماء کی باپ شریک (علاتی) بہنیں تھیں، جب کہ ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث، ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ، حضرت ام فضل بنت حارث زوجۂ حضرت عباس بن عبدالمطلب، حضرت لبابۂ صغریٰ بنت حارث والدۂ حضرت خالد بن ولید، حضرت عصما (یا عصمہ) بنت حارث زوجۂ ابی بن خلف، حضرت عزہ بنت حارث زوجۂ حضرت زیاد بن عبداللہ اور ہزیلہ (ام حفید) بنت حارث حضرت اسماء بنت عمیس کی ماں شریک (اخیافی) بہنیں تھیں۔ محمیہ بن جز زبیدی ان کے اخیافی بھائی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور

حضرت عباس بن عبدالمطلب کی سالی ہونے کی وجہ سے حضرت اسماء کو بہترین میکے والا سمجھا جاتا ہے۔

ام عبداللہ ان کی کنیت تھی۔

حضرت اسماء بنت عمیس 'اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'* میں سے تھیں، ابن اسحٰق کی مرتبہ فہرست کے مطابق اسلام کی طرف سبقت کرنے والوں میں ان کا نمبر چونتیسواں تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں جانے سے پہلے (۶۱۵ء میں) آپ کی بیعت کر کے اسلام قبول کیا۔

تب حضرت اسماء کی شادی حضرت جعفر بن ابوطالب سے ہو چکی تھی۔

رجب ۵؍ نبوی (۶۱۶ء) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی ایذا رسانیوں کو دیکھ کر صحابہ کو مشورہ دیا کہ حبشہ (Abyssinia, Ethiopia) کو ہجرت کر جائیں۔ فرمایا: وہاں ایسا بادشاہ (King of Axum) حکمران ہے جس کی سلطنت میں ظلم نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ سب سے پہلے پندرہ جلیل القدر صحابہ اور ان کے اہل خانہ مدینہ سے حبشہ روانہ ہوئے۔ حضرت عثمان بن عفان اور ان کی اہلیہ، دختر رسول حضرت رقیہ اس قافلے میں شامل تھے۔ اسے ہجرت اولیٰ کہا جاتا ہے۔ چند ماہ کے بعد دو کشتیوں پر سوار سڑسٹھ اہل ایمان کا دوسرا گروپ نکلا جس کی قیادت حضرت جعفر بن ابوطالب نے کی۔ حضرت اسماء بنت عمیس اپنے شوہر کے ساتھ تھیں۔ یہ پہلی ہجرت حبشہ کا دوسرا مرحلہ تھا۔ دونوں گروپوں کے مہاجرین کی مجموعی تعداد تراسی تھی۔

قیام حبشہ کے دوران میں حضرت اسماء کے بیٹے حضرت عبداللہ بن جعفر، حضرت محمد بن جعفر اور حضرت عون بن جعفر پیدا ہوئے۔

۷ھ (۶۲۸ء): ہجرت مدینہ کو سات برس بیت گئے تو حبشہ میں موجود حضرت جعفر بن ابوطالب اور باقی مہاجرین نے یہ کہہ کر مدینہ جانے کی خواہش ظاہر کی کہ ہمارے نبی غالب آ گئے ہیں اور دشمن مارے جا چکے ہیں۔ نجاشی نے زاد راہ اور سواریاں دے کر ان کو رخصت کیا (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۴۷۸)۔ کچھ مہاجرین ان سے دو سال قبل مدینہ پہنچ چکے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ میں رہ جانے والے مہاجرین کو واپس لانے کے لیے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو بھیج رکھا تھا۔ حضرت اسماء بنت عمیس اپنے شوہر حضرت جعفر طیار اور بیٹے حضرت عبداللہ بن جعفر کے ساتھ اس قافلے میں شامل تھیں جو دو کشتیوں کے ذریعے سے حبشہ سے حجاز کے ساحل پر اترا اور وہاں سے اونٹوں پر سوار ہو کر مدینہ پہنچا۔ اللہ کی راہ میں یہ ان کی دوسری ہجرت تھی۔ اس وقت حدیبیہ کا معاہدۂ صلح کرنے کے بعد

* التوبہ ۹: ۱۰۰۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر میں مصروف تھے۔ آپ خیبر فتح کرنے کے بعد مدینہ لوٹے تو حضرت جعفر نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے انھیں اپنے ساتھ چمٹا لیا، معانقہ کیا، آنکھوں کے درمیان پیشانی پر بوسہ لیا اور فرمایا: میں بہت خوش ہوں، معلوم نہیں، جعفر کے آنے سے یا خیبر فتح ہونے پر (مستدرک حاکم، رقم ۴۹۴۱)۔ حضرت جعفر نے وہ تحائف آپ کو پیش کیے جو نجاشی اور اس کے بھتیجے ذومخمر نے بھیجے تھے۔ ابن خلدون نے حبشہ سے لوٹنے والوں میں حضرت محمد بن جعفر اور حضرت عون بن جعفر کے نام بھی شامل کیے ہیں۔

ان دنوں حضرت عمر اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس آئے۔ وہاں حضرت اسماء بنت عمیس بھی موجود تھیں۔ انھوں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ حضرت حفصہ نے بتایا: اسماء ہیں، کہا: کیا حبشیہ اور سمندر پار رہنے والی؟ حضرت اسماء نے ہاں کہا تو حضرت عمر بولے: ہم ہجرت کرنے میں تم سے بازی لے گئے، اس لیے ہمارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ حق ہے۔ حضرت اسماء غصے میں آگئیں اور جواب دیا: آپ نے سچ کہا: آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے، وہ آپ کے بھوکوں کو کھلاتے رہے، آپ کے جاہلوں کو دین سکھاتے رہے۔ ہم دور افتادگان کا آپ سے کیا مقابلہ؟ ہمارا کفار کی سرزمین میں جا پڑنا اللہ و رسول کی محبت میں تھا۔ بخدا! میں کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر نہ کر دوں۔ ہم ہی تھے جنھیں ایذائیں دی گئیں اور جو خوف میں مبتلا رہے۔ میں جھوٹ بولوں گی نہ بات کو بڑھا کر بیان کروں گی۔ حضرت اسماء شکایت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا: عمر کا مجھ پر تم سے زیادہ حق نہیں۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے تو ایک ہجرت کی، تم کشتی والوں نے دو ہجرتیں کیں، ایک نجاشی کی طرف اور ایک میری طرف۔ حضرت اسماء بتاتی ہیں کہ ابوموسیٰ اشعری اور کشتیوں میں میرے ہم سفر مہاجرین حبشہ میرے پاس جمع ہوتے اور مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں پوچھتے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر انھیں کوئی خوشی ہوئی تھی، نہ ان کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے زیادہ کسی شے کی عظمت جاگزیں ہوئی تھی (بخاری، رقم ۴۲۳۰، ۴۲۳۱۔ مسلم، رقم ۲۵۰۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۴۰۹۔ دلائل النبوۃ ۴/ ۲۴۵)۔ اسی مضمون کی حامل ایک اور روایت میں اتنا فرق ہے کہ حضرت عمر کا حضرت اسماء سے یہ مکالمہ مدینہ کی کسی گلی میں ہوا (مسند احمد، رقم ۱۹۵۲۴)۔

عمرۂ قضا ادا کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ مکہ سے لوٹنے لگے تو سید الشہدا حضرت حمزہ کی بیٹی عمارہ چچا چچا کہتے ہوئے آپ کے پیچھے لپکی۔ اس اثنا میں حضرت علی نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر حضرت فاطمہ کے حوالے کر دیا۔ مدینہ پہنچے تو حضرت علی، حضرت زید اور حضرت جعفر میں جھگڑا ہو گیا۔ حضرت علی نے کہا: میں اس پر زیادہ حق

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رکھتا ہوں، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ان کے بھائی حضرت جعفر نے کہا: یہ میرے بھی چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میری بیوی ہے۔ حضرت زید بن حارثہ نے کہا: یہ میری بھتیجی ہے (جنگ احد میں حضرت حمزہ نے اپنی وصیت پوری کرنے کی ذمہ داری حضرت زید کو سونپی تھی، اس لیے ان کا خیال تھا کہ وہ اس کی پرورش کا حق رکھتے ہیں)۔آپ نے یہ فرما کر کہ''خالہ ماں ہی کی طرح ہوتی ہے''، بچی حضرت جعفر اور حضرت اسماء بنت عمیس کے سپرد کر دی۔ حضرت اسماء بنت عمیس بچی کی والدہ حضرت سلمیٰ بنت عمیس کی سگی بہن تھیں۔

۷ھ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث بن عمیر کی سربراہی میں ایک وفد شاہ بُصری کے نام خط دے کر بھیجا۔ یہ وفد شام کے سرحدی علاقے بلقا کے مقام موتہ سے گزر رہا تھا کہ وہاں کے حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی نے حضرت حارث کا گلا گھونٹا اور باقی ارکان کو شہید کر دیا۔آپ کے کسی ایلچی کی جان لینے کا یہ ایک ہی واقعہ ہوا، اس لیے آپ نے شہدا کا بدلہ لینا اور شرحبیل کی تادیب کرنا ضروری سمجھا۔ جمادی الاولیٰ ۸ھ (ستمبر ۶۲۹ء) میں تین ہزار کا لشکر تیار کر کے آپ نے حضرت زید بن حارثہ کو امیر مقرر کیا اور فرمایا:''اگر زید شہید ہوئے تو جعفر بن ابوطالب امیر ہوں گے، اگر جعفر شہادت پا گئے تو عبداللہ بن رواحہ ان کی جگہ لیں گے۔وہ بھی شہادت سے سرفراز ہوئے تو مسلمان باہمی رضا مندی سے اپنا امیر چن لیں'' (بخاری، رقم ۴۲۶۱)۔شرحبیل کو جیش اسلامی کی روانگی کی خبر ملی تو اس نے مقابلے کے لیے دو لاکھ سپاہیوں پر مشتمل بڑی فوج تیار کی۔بحیرۂ مردار کے ساحل پر، دریاے اردن کے مغربی کنارے سرزمین بلقا (موجودہ کرک) میں مشارف کے مقام پر دونوں لشکروں کا سامنا ہوا۔حضرت زید نے چھ دن تک ضرب وفرار (hit and run) کی اسٹریٹیجی سے کام لیا۔ساتویں دن وہ سامنے (front) سے نمودار ہوئے، جونہی رومی فوج کے پرے بڑھنے لگے، انھوں نے پسپائی اختیار کر لی۔رومی فوج نے ان کا پیچھا کیا، لیکن دو لاکھ کی فوج عجلت میں اپنی ترتیب قائم نہ رکھ سکی۔موتہ کے مقام پر حضرت زید نے پلٹ کر بھرپور حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سو صفوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا حصہ ان کا ہدف بنا جو حملے کی تاب نہ لا سکا۔رومیوں نے راہ فرار پکڑی اور اپنے لشکر ہی کو روندتے ہوئے کھلے میدان کی طرف بھاگے۔اس اثنا میں حضرت زید بن حارثہ پر چاروں طرف سے وار ہو رہے تھے، زیادہ خون بہ جانے سے وہ گھوڑے سے گر پڑے اور جام شہادت نوش کیا۔فرمان نبوی کے مطابق حضرت جعفر بن ابوطالب فوراً آگے بڑھے، اپنے سرخ گھوڑے سے اترے، اسے ذبح کیا، اسلحہ ہلکا کیا اور علم تھام کر پیادہ ہی لڑنا شروع کر دیا۔انھوں نے پچاس سے زائد زخم کھائے، پہلے ان کا دایاں بازو کٹا، انھوں نے علم بائیں ہاتھ میں تھام لیا پھر بایاں بازو کٹا، انھوں نے کٹے ہوئے بازوؤں سے اسے سہار لیا اور آخری دم تک جاں فشانی سے لڑتے رہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آخر کار حضرت جعفر کے جسم میں ایک نیزہ آ کر کھبا تو وہ اسی طرح چلتے ہوئے دشمنوں کے ایک فوجی سے جا ٹکرائے۔ نیزہ اس کے جسم سے پار ہوا تو بیک وقت دونوں موت سے ہم کنار ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی جاں فشانی سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن ولید نے علم تھاما اور ایک دن مزید جنگ کرنے کے بعد لشکر کو بہ حفاظت مدینہ واپس لے آئے۔ حضرت جعفر کو ثنیۃ الکرک کے مقام پر دفن کیا گیا، ان کی عمر اکتالیس برس تھی۔

مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہداے جنگ موتہ کی اطلاع ملی تو آپ منبر پر تشریف لائے اور حضرت زید، حضرت جعفر اور حضرت ابن رواحہ کے لیے دعاے مغفرت فرمائی (مسند احمد، رقم ۲۲۵۶۶)۔ پھر آپ حضرت جعفر کے گھر روانہ ہوئے۔

حضرت اسماء بنت عمیس بیان کرتی ہیں: میں نے چالیس کھالیں دباغت کر کے تیار کیں، آٹا گوندھا اور بچوں کو نہلا دھلا کر تیل لگا کر فارغ ہوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور مجھ سے مخاطب ہوئے: اے اسماء، جعفر کے بچے کہاں ہیں؟ میں انھیں لے کر آئی، آپ نے انھیں اس طرح چمٹایا اور پیار کیا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، شاید آپ کو جعفر کی کوئی خبر ملی ہے؟ فرمایا: ہاں، آج وہ شہید ہو گئے ہیں، انھیں سونے کے پلنگ پر جنت لے جایا گیا ہے۔ میں چیخ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور عورتوں کو اکٹھا کرنے لگی تو آپ نے فرمایا: اسماء، واہی تباہی نہ بولو اور سینہ مت پیٹو۔ پھر آپ حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت فاطمہ ہائے چچا! کہہ کر روتی ہوئی آئیں تو آپ نے فرمایا: جعفر جیسوں ہی کے لیے رونے والیوں کو رونا چاہیے۔ آپ نے آل جعفر کے لیے کھانا پکانے کا حکم دیا اور فرمایا: آج وہ مغموم ہیں اور اپنے کھانے کا انتظام نہ کر سکیں گے (ترمذی، رقم ۹۹۸۔ ابن ماجہ، رقم ۱۶۱۱۔ مسند احمد، رقم ۲۷۰۸۶۔ الکامل، ابن اثیر ۲/ ۱۱۴)۔ جنگ موتہ کا لشکر مدینہ پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن جعفر کو اونٹنی پر اپنے آگے سوار کیا۔ کچھ اصحاب نے اہل لشکر کو میدان جنگ سے بھاگ آنے کے طعنے دیے تو آپ نے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ ان شاء اللہ یہ دوبارہ حملہ آور ہوں گے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جعفر کے گھر آئے تو فرمایا: میرے بھتیجوں کو لے آؤ۔ وہ ابھی چھوٹے چھوٹے تھے۔ آپ نے انھیں پیار کیا، ساتھ چمٹایا اور حجام کو بلا کر ان کے سر منڈائے پھر فرمایا: محمد بن جعفر ہمارے چچا ابوطالب سے مشابہت رکھتا ہے۔ عبداللہ بن جعفر کی جسمانی ساخت اور اس کے اخلاق مجھ سے ملتے جلتے ہیں۔ آپ نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑا، اسے بلند کیا اور تین بار دعا فرمائی: اے اللہ! تو جعفر کے اہل خانہ میں اس کا قائم مقام ہو جا، بہترین

طریقے سے جس طرح تو اپنے نیک بندوں میں سے کسی کی جگہ پر کر دیتا ہے۔ عبداللہ کے ہاتھوں میں برکت ڈال دے۔ آپ نے حضرت اسماء سے کہا: تو تنگ دستی سے ڈرتی ہے، میں دنیا و آخرت میں ان بچوں کا ولی ہوں، ان کے باپ کی جگہ ہوں (ابوداؤد، رقم ۴۱۹۲۔ مسند احمد، رقم ۱۷۵۰)۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: آج کے بعد میرے بھائی کا بین نہ کرنا، اسے دو پر مل گئے ہیں، وہ ان کے ذریعے سے جنت میں جہاں چاہتا ہے، اڑتا پھرتا ہے (ترمذی، رقم ۳۷۶۳)۔

آپ نے عبداللہ اور محمد کو دیکھ کر پوچھا: کیا وجہ ہے کہ میں اپنے بھتیجوں کو کم زور بدن دیکھ رہا ہوں؟ کیا ان کی غذا پوری نہیں ہوتی؟ حضرت اسماء نے کہا: ان کو نظر جلد لگ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا: ان کو دم درود کرو۔ حضرت اسماء نے جھاڑ پھونک کے کچھ کلمے بتائے تو آپ نے فرمایا: ہاں، ان پر پھونکو (مسلم، رقم ۵۷۷۷۔ مسند احمد، رقم ۱۴۵۷۳)۔ دوسری روایت مختلف ہے، حضرت اسماء بنت عمیس نے خود سوال کیا: یا رسول اللہ، جعفر کے بچوں کو نظر بہت جلد لگتی ہے، کیا میں ان کے لیے جھاڑ پھونک کروں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، کیونکہ اگر کسی چیز کے تقدیر پر غلبہ پانے کا امکان ہوتا تو وہ نظر ہی ہوتی'' (ترمذی، رقم ۲۰۵۹۔ ابن ماجہ، رقم ۳۵۱۰۔ مسند احمد، رقم ۲۷۴۷۰)۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر سے حاصل ہونے والے مال فے میں سے آل جعفر کے لیے پچاس وسق (ایک وسق: ساٹھ صاع، پچاس وسق: پچاس اونٹوں پر لادا جانے والا غلہ) سالانہ مقرر فرمائے۔

حضرت اسماء نے اپنے شوہر حضرت جعفر کا مرثیہ یوں کہا:

فآليت لا تنفك نفسي حزينة عليك و لا ينفك جلدي أغبرا

''میں نے قسم کھالی ہے کہ میرا دل برابر آپ کے غم میں مبتلا رہے گا اور میرے زخم ہر دم تازہ رہیں گے۔''

فللّٰه عينا من رأى مثله فتى أكرّ و أحمى في الهياج و أصبرا

''اللہ اس شخص کی آنکھ ٹھنڈی کرے جس نے اس جیسا جوان دیکھا جو معرکوں میں مڑ مڑ کر حملہ کرنے والا، قوم کی خوب حفاظت کرنے والا اور جنگ کی سختیوں پر صبر کرنے والا تھا۔''

حضرت اسماء بنت عمیس بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعفر کے قتل کے تیسرے روز میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: آج کے بعد سوگ نہ کرنا (مسند احمد، رقم ۲۷۰۸۳)۔ دوسری روایت میں وضاحت ہے کہ تین دن ماتمی لباس پہننا، پھر جو جی چاہے کرنا (مسند احمد، رقم ۲۷۴۶۷)۔ 'جو جی چاہے کرنا' کی شرح اس روایت سے ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء کو پیغام بھیجا کہ آنسو خشک کر لے اور سرمہ لگا لے (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۹۱۲۴)۔ اس حدیث کی بنیاد پر حسن بصری تین دن گزرنے کے بعد بیوہ کے لیے خوشبو لگانا اور زیب و زینت کرنا

جائز قرار دیتے ہیں۔

ابن عربی کہتے ہیں: یہ حدیث باطل ہے، آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیوہ کو آنکھ آنے پر بھی سرمہ لگانے کی اجازت نہیں دی (بخاری، رقم ۵۳۳۸۔ مسلم، رقم ۳۷۲۴۔ ابوداؤد، رقم ۲۲۹۹۔ ترمذی، رقم ۱۱۹۷۔ ابن ماجہ، رقم ۲۰۸۴۔ موطا امام مالک، رقم ۱۸۵۷)۔ یہ حدیث صحیح بھی ہوتی تو اتنا ثابت ہوتا کہ تین دن کے بعد بیوہ سوگ کا لباس اتار سکتی ہے۔ ابن حزم اسے منقطع کہتے ہیں، طحاوی منسوخ قرار دیتے ہیں۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل نہیں، تاہم وہ بھی اسے معمول بہ نہیں سمجھتے، کیونکہ اس کا متن دیگر احادیث صحیحہ کے خلاف ہے جن کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ کا سوگ چار ماہ دس دن قرار دیا ہے (بخاری، رقم ۵۳۳۴۔ ابوداؤد، رقم ۲۲۹۹۔ ترمذی، رقم ۱۱۹۶۔ ابن ماجہ، رقم ۲۰۸۷۔ موطا امام مالک، رقم ۱۸۵۵)۔ شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں: ہوسکتا ہے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سرمہ لگانے سے اس لیے منع کیا ہو کہ اس عورت کی بیماری ہلکی ہونے کی وجہ سے آپ کی نگاہ مبارکہ میں اس کا عذر ثابت نہ ہوتا ہو یا سرمہ ڈالے بغیر ہی اس کی آنکھ کے صحیح ہونے کا احتمال ہو۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اہل ظاہر عدت گزارتی ہوئی بیوہ کو سرمہ استعمال کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے، چاہے اس کی بیماری کتنی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو اور آنکھ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ تاہم جمہور فقہا اس دوران میں آنکھ آنے پر سرمہ لگانے کی اجازت دیتے ہیں۔ امام مالک کہتے ہیں کہ مجبوری کی صورت میں اللہ کا دین سہولت دیتا ہے (موطا امام مالک، رقم ۱۸۶۲)۔ ان کی دلیل ام المومنین حضرت ام سلمہ کی یہ روایت ہے: ابوسلمہ کی وفات کے بعد (ایام عدت میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے۔ میں نے آنکھوں پر ایلوا (مصبّر، aloe) لگا رکھا تھا۔ فرمایا: یہ کیا؟ میں نے کہا: ایلوا ہے، اس میں خوشبو نہیں ہوتی۔ آپ نے ارشاد کیا: یہ چہرے کو جوان دکھاتا ہے، رات کے وقت لگاؤ اور دن کو صاف کر دو۔ مزید فرمایا: (عدت کے دوران میں) خوشبو اور منہدی لگا کر کنگھی نہ کیا کرو، بیری کے پانی ہی سے اپنا سر ڈھانپ لیا کرو (ابوداؤد، رقم ۲۳۰۵۔ نسائی، رقم ۳۵۶۷۔ موطا امام مالک، رقم ۱۸۶۶)۔ ایک بیوہ نے حضرت ام سلمہ سے استفسار کیا کہ میری آنکھ آئی ہوئی ہے، میں آنکھوں میں سرمہ لگا سکتی ہوں؟ انھوں نے فتویٰ دیا: انتہائی ضرورت پڑنے پر یا مجبوری کی حالت میں صرف رات کے وقت سرمہ لگاؤ اور صبح ہونے پر پونچھ دو (نسائی، رقم ۳۵۶۷۔ موطا امام مالک، رقم ۱۸۶۰)۔ امام شافعی کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ معتدہ صرف رات کے وقت سرمہ لگا سکتی ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں: حضرت ام سلمہ کا واقعہ حضرت جعفر بن ابوطالب کی شہادت سے دو سال پہلے پیش آیا (یعنی بعد میں آنے والی صحیح روایت پر عمل کیا جائے گا اور پہلا حکم منسوخ سمجھا جائے گا)۔ مزید برآں، یہ روایت منقطع ہے (محلیٰ ۱۰/ ۲۸۰) کچھ علما

نے آنکھ میں سرمہ ڈالنے کی نہی کو نہی تنزیہ پر محمول کیا ہے۔

حضرت اسماء بنت عمیس کی عدت پوری ہوئی تو حضرت ابوبکر نے انھیں نکاح کا پیغام بھیجا۔ ابن حجر کی نقل کردہ روایت کے مطابق جنگ حنین کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کا نکاح پڑھایا۔ عرب میں بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کے عقد ثانی میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تھی۔ ایک معمول ہونے کی وجہ سے اسے برا بھی نہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت اسماء بنت عمیس نے حضرت جعفر طیار کا مرثیہ کہا تو اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ اپنا گھر کبھی نہ بسائیں گی۔ ہمیں یہ روایت عجیب لگی کہ حضرت ابوبکر کے ساتھ ان کا بیاہ ہوا تو ولیمے کے موقع پر حضرت علی نے ان کا کہا مرثیہ سنا کر انھیں شرمندہ کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، حضرت اسماء بنت عمیس قریب بیٹھی ہوئی تھیں کہ آپ نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ پھر فرمایا: ''جعفر بن ابوطالب جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کی معیت میں گزرے ہیں اور مجھے سلام کیا ہے۔ اسماء، تو بھی انھیں سلام کا جواب دے'' (مستدرک حاکم، رقم ۴۹۴۵)۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

شعبان ۹ھ: حضرت عثمان بن عفان کی اہلیہ، دختر رسول حضرت ام کلثوم کا انتقال ہوا تو حضرت اسماء بنت عمیس، حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب اور حضرت ام عطیہ نے انھیں غسل دیا۔

ذوالحجہ ۱۰ھ (مارچ ۶۳۲ء): آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نوے ہزار صحابہ کے جلو میں حجۃ الوداع کے لیے روانہ ہوئے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت اسماء بنت عمیس بھی عازمین حج کے قافلے میں شامل تھے۔ آپ ساڑھے پانچ میل چل کر مدینہ کے میقات ذوالحلیفہ پر پہنچے تھے کہ محمد بن ابوبکر پیدا ہوئے۔ حضرت ابوبکر زچہ و بچہ کو مدینہ واپس بھیجنا چاہتے تھے، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: اسماء غسل کر کے حالت نفاس ہی میں حج کا احرام باندھ لیں (مسلم، رقم ۲۸۷۹۔ ابوداؤد، رقم ۱۷۴۳۔ نسائی، رقم ۲۱۵۔ مسند احمد، رقم ۲۷۰۸۴۔ موطا امام مالک، رقم ۹۵۱۔ مسند دارمی، رقم ۱۸۳۹)۔ دوسری روایت کے مطابق ارشاد ہوا: غسل کر کے لنگوٹ کسیں اور احرام باندھ لیں (مسلم، رقم ۲۹۲۲۔ ابوداؤد، رقم ۱۹۰۵۔ نسائی، رقم ۲۹۲۔ ابن ماجہ، رقم ۲۹۱۳۔ مسند احمد، رقم ۱۴۴۳۹۔ مسند دارمی، رقم ۱۸۸۵)۔ تیسری روایت میں اضافہ ہے، اسماء بیت اللہ کا طواف نہ کریں، البتہ دوسرے لوگوں کی طرح حج کے بقیہ تمام افعال بجا لائیں (ابن ماجہ، رقم ۲۹۱۲)۔ چنانچہ حضرت اسماء نے غسل کر کے لنگوٹ کسا، احرام باندھا اور عازم سفر حج ہو گئیں۔

ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماء بنت عمیس کے ہاں آئے تو وہ شبرم نامی جھاڑی کوٹ رہی تھیں۔ آپ نے دریافت فرمایا: اس کا کیا کروگی؟ انھوں نے بتایا: فلاں بیمار پیے گا۔ فرمایا: اگر کوئی شے موت کو ٹال سکتی یا موت سے فائدہ دیتی تو سنا ہوتا (مستدرک حاکم، رقم ۷۴۴۰)۔ شبرم کی جھاڑی سعودی عرب، یمن، کویت، عمان اور شمالی افریقہ کے ممالک مصر، تیونس، لیبیا، الجزائر، مراکش میں پائی جاتی ہے۔ برصغیر میں نہ پائے جانے کی وجہ سے شبرم کا کوئی اردو یا ہندی متبادل نہیں، البتہ انگریزی میں یہ Zilla Spinosa Prantl کہلاتی ہے۔ Prantl کا لاحقہ اصل میں اس plant پر تحقیق کرنے والے جرمن ماہر نباتیات Karl Anton Eugen Prantl (۱۸۴۹ء تا ۱۸۹۳ء) کا نام ہے۔ floraofqatar.com نامی website میں شبرم کے علاوہ shaga اور silla اس کے عام فہم نام (common names) بتائے گئے ہیں۔

اسی موضوع سے متعلق دوسری روایت ذرا مختلف ہے۔ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء سے پوچھا: تم کس چیز کا جلاب لیتی ہو؟ بتایا، شبرم۔ فرمایا: گرم ہوتا ہے گرم۔ حضرت اسماء نے کہا: پھر میں نے سنا کا جلاب لیا تو فرمایا: اگر کسی شے میں موت سے شفا ہوتی تو وہ سنا ہوتا (ترمذی، رقم ۲۰۸۱۔ ابن ماجہ، رقم ۳۴۶۱۔ مسند احمد، رقم ۲۷۰۸۰۔ مستدرک حاکم، رقم ۷۴۴۱)۔ سنا، سنا حجازی، سنا کلی یا سنا مکی (senna) عرب میں پایا جانے والا پھلی دار، قبض کشا پودا ہے جس کا قہوہ بنا کر پیا جاتا ہے۔ یہ انتڑیوں کے اعصابی نظام (myenteric plexus) کو انگیخت کر کے بڑی آنت کی حرکت زیادہ کرتا ہے، پانی کو آنتوں سے خون میں شامل ہونے سے روکتا ہے۔ ان دونوں عملوں (actions) سے قبض کشائی ہوتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایک بار حضرت ابوبکر گھر آئے تو دیکھا کہ ان کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس کے پاس بنو ہاشم کے کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ انھیں حضرت اسماء پہ پورا بھروسا تھا۔ پھر بھی یہ اچھا نہ لگا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ نے اسماء کو تہمتوں سے پاک کر دیا ہے۔ پھر آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: آج کے بعد کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کوئی داخل نہ ہو، مگر اس کے ساتھ ایک یا دو آدمی ہوں (مسلم، رقم ۵۷۲۸۔ مسند احمد، رقم ۶۵۹۵)۔ شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں: حضرت ابوبکر کو غیرت جبلی کی وجہ سے برا محسوس ہوا، حالاں کہ انھیں یقین تھا کہ حضرت اسماء نے آنے والوں کو کسی بھلے مقصد ہی سے گھر میں بٹھایا ہوگا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہی اس لیے فرمائی کہ تہمت کے اسباب کا سد باب کیا جائے۔ آج کے زمانہ میں ایک سے زیادہ آدمی ہوں تو بھی بدگمانی کا اندیشہ ہو سکتا ہے، اس لیے احناف اجنبی عورت کے ساتھ مردوں کی خلوت حرام سمجھتے ہیں۔

حضرت عمرو بن عاص نے اپنے غلام ذکوان کو کسی کام سے حضرت اسماء بنت عمیس کے پاس بھیجا اور اسے ہدایت کی کہ پہلے حضرت علی سے اجازت لے لینا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ عورتوں سے ان کے خاوندوں کی اجازت کے بغیر ملیں (ترمذی، رقم ۲۷۷۹۔ مسند احمد، رقم ۱۷۷۶۷)۔

حضرت اسماء بنت عمیس بیان کرتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا: میں تمھیں وہ کلمات نہ سکھا دوں جو تم کسی مصیبت کے آنے سے پہلے یا اس میں مبتلا ہونے کے بعد کہہ لیا کرو؟ 'اللّٰه اللّٰه ربي، لا أشرك به شيئًا'، ''اللہ، اللہ میرا رب ہے، میں کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤں گی'' (ابوداؤد، رقم ۱۵۲۵۔ ابن ماجہ، رقم ۳۸۸۲۔ مسند احمد، رقم ۲۷۰۸۲)۔

حضرت عائشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی ہیں: آپ شدت تکلیف سے بے ہوش ہوئے تو اسماء بنت عمیس نے کہا: یہ شدت پسلی کے درد (ذات الجنب، نمونیا) ہی سے ہو سکتی ہے۔ آپ کو نمونیا کی دوا پلا دی جائے تو اچھا ہو۔ آپس میں مشورہ کر کے ہم نے دہن مبارک میں دوا انڈیلی تو آپ اشارہ کرتے رہے کہ مجھے دوا نہ پلاؤ۔ ہم نے یہی سمجھا کہ ہر بیمار دوا پینے سے کراہت محسوس کرتا ہے۔ جب آپ کو ہوش آیا تو ناراض ہو کر فرمایا: میں نے تمھیں دوا پلانے سے روکا نہیں تھا۔ ہم نے کہا: سب مریض دوا پینے سے انکار کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا: میری آنکھوں کے سامنے گھر میں موجود ہر فرد کو (تادیباً) دوا پلائی جائے۔ عباس کو رہنے دیا جائے، کیونکہ وہ تمھارے ساتھ موجود نہ تھے (بخاری، رقم ۴۴۵۸۔ مسلم، رقم ۵۸۱۳۔ مسند احمد، رقم ۱۷۸۴۔ مستدرک حاکم، رقم ۷۴۴۷)۔ دوسری روایت میں آپ کا یہ ارشاد نقل ہوا: یہ دوا وہ عورتیں لائی ہیں جو وہاں سے آئی ہیں، یہ کہہ کر سرزمین حبشہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ اور حضرت اسماء بنت عمیس حبشہ میں رہ کر آئی تھیں۔ آپ نے فرمایا: ذات الجنب کی بیماری شیطان کی طرف سے آتی ہے اور اللہ اس بیماری کو مجھ پر مسلط نہ کرے گا (مسند احمد، رقم ۲۷۴۶۹۔ مستدرک حاکم، رقم ۸۲۳۵)۔ ابن اسحٰق کی روایت مختلف ہے، حضرت ام سلمہ، حضرت میمونہ، حضرت اسماء بنت عمیس اور حضرت عباس نے مل کر آپ کو دوا پلانے کا فیصلہ کیا اور حضرت عباس نے کہا: دوا میں پلاتا ہوں (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲۲۴/۴)۔ طبری کا کہنا ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد آپ کو بتایا گیا کہ آپ کے چچا عباس نے آپ کو دوا پلائی ہے (طبری ۲۳۰/۲)۔

واقدی کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات میں صحابہ نے شک کیا، کچھ کا خیال تھا کہ آپ کی وفات نہیں ہوئی۔ تب حضرت اسماء بنت عمیس نے آپ کے کندھوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر مہر نبوت کو ٹٹولا اور اسے نہ پا کر

آپ کی وفات کا اعلان کر دیا۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف اور منقطع ہے۔

رمضان ۱۱ھ: حضرت فاطمہ مرض وفات میں مبتلا ہوئیں تو حضرت اسماء بنت عمیس سے کہا: مرنے کے بعد عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے، مجھے برا لگتا ہے۔ چار پائی پر رکھ کر ان پر ایک کپڑا ڈال دیا جاتا ہے جس سے ان کا جسم نمایاں ہوتا ہے۔ حضرت اسماء نے کہا: دین و ایمان کی قسم، میں آپ کے لیے اس طرح کی نعش بناؤں گی جیسا کہ سرزمین حبشہ میں بناتے دیکھی ہے۔ حضرت فاطمہ نے کہا: بنا کر دکھایئے۔ تب انھوں نے کھجور کی چند تر ٹہنیاں منگوائیں، ان کے پتے کاٹ کر چار پائی پر اس طور سے رکھ دیں کہ درمیان سے ابھری ہوئی تھیں پھر ان پر کپڑا ڈال دیا۔ خطۂ عرب میں یہ سب سے پہلے بنائی جانے والی نعش تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت فاطمہ مسکرائیں۔ حضرت اسماء بنت عمیس کہتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد میں نے انھیں اسی دن تبسم کرتے دیکھا۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ہم نے اسی طریقے پر ان کا جنازہ اٹھایا اور رات کے اندھیرے میں تدفین کر دی (مستدرک حاکم، رقم ۴۷۶۳)۔ ۲۰ھ میں حضرت اسماء بنت عمیس نے ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کے لیے بھی نعش بنائی۔

حضرت فاطمہ نے وصیت کی کہ حضرت اسماء بنت عمیس ان کو غسل دیں۔ چنانچہ حضرت اسماء اور حضرت علی نے مل کر ان کو غسل دیا (مستدرک حاکم، رقم ۴۷۶۹)۔ حضرت عائشہ بھی اندر آنا چاہتی تھیں، لیکن حضرت اسماء نے انھیں روک دیا۔ انھوں نے حضرت ابوبکر سے شکایت کی۔ انھیں بتایا گیا کہ حضرت فاطمہ کی وصیت تھی کہ انھیں حضرت اسماء بنت عمیس اور حضرت علی نہلائیں، کوئی تیسرا فرد شامل نہ ہو تو کوئی اعتراض نہ کیا۔

حضرت ابوبکر کی وفات ہوئی تو ان کی وصیت کے مطابق حضرت اسماء نے انھیں غسل دیا۔ غسل دینے کے بعد انھوں نے جنازے پر موجود کبار مہاجرین سے استفسار کیا کہ میں روزے سے ہوں اور آج سخت سرد دن ہے، کیا مجھ پر غسل کرنا واجب ہے؟ جواب ملا: نہیں (موطا امام مالک، رقم ۶۲۲۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۶۱۲۳)۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت ابوبکر نے حضرت اسماء کو یہ وصیت بھی کی تھی کہ غسل دینے کے دن وہ روزہ نہ رکھیں، لیکن وہ بھول گئیں۔ انھیں آخری وقت حضرت ابوبکر کی وصیت یاد آئی تو پانی منگا کر پیا اور عہد کیا کہ اب ابوبکر کی قسم ٹوٹنے نہ دوں گی۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکر نے حکم دیا کہ اگر چاہیں تو اسماء میرے بیٹے محمد سے مدد لے لیں۔ راوی کہتے ہیں کہ محمد بن ابوبکر کو میت نہلانے کا کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، جب کہ وہ تین برس کے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت اسماء کو غسل دینے کی وصیت کی تو انھوں نے کہا: میرے لیے یہ ممکن نہ ہوگا، تب انھوں نے کہا: عبدالرحمٰن تمھاری مدد کر دے گا۔

حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد حضرت علی نے حضرت اسماء بنت عمیس سے عقد کر لیا۔ حضرت ابوبکر کے گھر جنم لینے والے محمد بن ابوبکر حضرت اسماء کے ساتھ حضرت علی کی پرورش میں آ گئے۔ حضرت علی سے شادی کے بعد حضرت اسماء کے ہاں یحییٰ پیدا ہوئے۔ ابن کلبی نے ان کے دوسرے بیٹے عون کا ذکر کیا ہے۔ ابن اثیر نے حضرت اسماء بنت عمیس کا ایک تیسرا بیٹا محمد (اصغر) بتانے کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ شاید اسے حضرت علی کی باندی (ام ولد) نے جنم دیا۔ اس کے باوجود حضرت اسماء کو ام المحمدین (دو محمدوں کی والدہ) کہا جاتا ہے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر نے دیوان وظائف مرتب کیا تو حضرت اسماء بنت عمیس کا وظیفہ ایک ہزار درہم (یا دس ہزار) مقرر کیا۔ دوسری مہاجرات سابقات، حضرت اسماء بنت ابوبکر اور حضرت ام عبد (والدۂ حضرت عبداللہ بن مسعود) کا وظیفہ بھی ایک ہزار درہم تھا۔

حضرت اسماء بنت عمیس دین کا اچھا فہم رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب خوابوں کی تعبیر کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے۔ اپنی زندگی کا آخری خطبۂ جمعہ دینے کے لیے وہ منبر پر کھڑے ہوئے۔ حمد و ثنا کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کو یاد کیا۔ پھر اپنا خواب سنایا کہ مجھے ایسے لگا جیسے ایک سرخ مرغ نے مجھ کو دو ٹھونگے مارے۔ مجھے اپنی موت قریب نظر آنے لگی تو اسماء بنت عمیس سے اپنا خواب بیان کیا۔ انھوں نے یہ تعبیر کی ہے کہ مجھے ایک عجمی شخص قتل کرے گا (مسند احمد، رقم ۸۹)۔

حضرت اسماء بنت عمیس نے اپنے ہاتھ گدوائے (tattoo) ہوئے تھے۔ عفان نے دیکھا کہ وہ گدے ہوئے ہاتھوں سے حضرت ابوبکر سے مکھیاں جھل رہی تھیں۔

ایک بار حضرت اسماء بنت عمیس کے دو بیٹوں محمد بن جعفر اور محمد بن ابوبکر نے اپنے اپنے والد کا نام لے کر مفاخرت کا اظہار کیا۔ دونوں کہتے تھے: میرے والد تمھارے والد سے بہتر تھے، اس لیے میں صاحب شرف ہوں۔ حضرت علی نے حضرت اسماء کو ان کے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کو کہا۔ انھوں نے کہا: میں نے جعفر سے اچھا عرب جوان اور ابوبکر سے بڑھیا کہل نہیں دیکھا۔ حضرت علی نے کہا: تم نے میرے لیے کوئی وصف نہیں چھوڑا۔ اگر اس کے علاوہ فیصلہ دیتی تو میں ناراض ہوتا۔ تب حضرت اسماء نے کہا: ان تینوں (حضرت جعفر، حضرت ابوبکر اور حضرت علی) میں سے کم ترین بھی بہترین ہے۔

حضرت عبداللہ بن جعفر کی شادی حضرت زینب بنت علی سے ہوئی۔ ان کے بیٹے عبید اللہ، عون اور محمد کربلا میں شہید ہوئے۔ حضرت محمد بن جعفر (دوسری روایت، حضرت عون بن جعفر) کا بیاہ حضرت ام کلثوم بنت علی سے ہوا، ان

کی کوئی اولاد نہ ہوئی اور وہ جوانی ہی میں فوت ہو گئے۔ حضرت عون بن جعفر بھی لاولد رہے۔

حضرت اسماء کو خبر ملی کہ ان کے بیٹے محمد بن ابو بکر کو مصر میں قتل کر دیا گیا ہے تو وہ اپنے گھر میں جاے نماز پر بیٹھ گئیں اور غم و غصے کو دبانے کی کوشش کی، حتیٰ کہ ان کے پستانوں سے خون جاری ہو گیا۔

حدیث کی چار بڑی کتابوں میں حضرت اسماء بنت عمیس کی روایات پائی جاتی ہیں۔ حدیث انھوں نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی۔ ان سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں: حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابوموسیٰ اشعری، ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن جعفر، ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن شداد، ان کے پوتے قاسم بن محمد بن ابوبکر، پوتی ام عون بنت محمد بن جعفر، زید خثعمی، سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، عامر شعبی، عبید بن رفاعہ، عتبہ بن عبداللہ، ابو بردہ بن ابوموسیٰ اشعری، ابو یزید مدینی، فاطمہ بنت علی اور فاطمہ بنت حسین۔

حضرت اسماء بنت عمیس نے رسول اللہ کے سامنے اپنی کسی ضرورت کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: تم اس دن کیا کرو گی، جب لوگ ایک شخص (دجال) کے تسلط میں مبتلا ہو جائیں گے جو زمین کے چشموں اور باغات پر قابض ہو گا، جو اس کی پیروی کرے گا، اسے کھانے کو دے گا اور جو اس کا حکم نہ مانے گا، اسے محروم رکھے گا؟ حضرت اسماء نے سوال کیا: ایک باندی تندور پر روٹیاں لگواتی دھری رہ جائے گی؟ ہو سکتا ہے مجھے نماز پڑھتے ہوئے قابو کر لیا جائے، تب ہم کیا کریں گے؟ آپ نے فرمایا: اللہ اہل ایمان کو ایسے ہی محفوظ رکھے گا جیسے فرشتوں کو تسبیح کے ذریعے سے بچاتا ہے۔ اس شخص کی آنکھوں کے بیچ کافر لکھا ہو گا جسے ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ مومن دیکھ لے گا (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۹۸۸۱)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عائشہ کی رخصتی ہجرت کے بعد مدینہ میں ہوئی۔ تب حضرت اسماء بنت عمیس حبشہ میں تھیں۔ اس کے باوجود یہ بات ان سے منسوب کر دی گئی ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہ کو دلھن بنایا۔ انھوں نے اس پیالے سے دودھ بھی پیا جس میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ پی چکے تھے (مسند احمد، رقم ۲۷۴۷۱)۔ اصل میں یہ روایت حضرت اسماء بنت یزید (مسند احمد، رقم ۲۷۵۹۱) کی تھی جو غلطی سے حضرت اسماء بنت عمیس سے جوڑ دی گئی۔

باقر مجلسی نے حضرت فاطمہ کے نکاح میں حضرت اسماء بنت عمیس کی موجودگی کا ذکر کرنے کے ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ بنت عمیس نہیں، بلکہ حضرت اسماء بنت یزید تھیں (بحار الانوار: جلد ۱۸، باب تزویج فاطمۃ الزہراء)۔

کچھ باکمال محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس بحیرۂ احمر (Red Sea) عبور کر کے حبشہ سے مدینہ آتی جاتی رہی ہیں، اس لیے ان کے لیے حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ کی شادیوں میں آنا ممکن ہوا۔

کچھ منکر اور واہی روایات بھی حضرت اسماء بنت عمیس کے نام کر دی گئی ہیں جیسے یہ روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک بار صہبا کے مقام پر ظہر کی نماز پڑھائی پھر حضرت علی کو کسی کام بھیجا۔ وہ لوٹے تو آپ عصر پڑھا چکے تھے، آپ اپنا سر حضرت علی کی گود میں رکھ کر سو گئے۔ اسی حالت میں آپ پر وحی نازل ہوگئی، سورج غروب ہو گیا اور حضرت علی عصر کی نماز ادا نہ کر سکے۔ بیدار ہونے پر آپ کو معلوم ہوا تو دعا فرمائی: 'اے اللہ، تیرے بندے علی نے اپنے آپ کو تیرے نبی سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اے اللہ، وہ تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں مشغول تھا، اس لیے اس کی خاطر سورج لوٹا دے۔ چنانچہ پہاڑوں پر دوبارہ دھوپ چمکنے لگی، حضرت علی نے عصر کی نماز پڑھ لی تو سورج پھر غروب ہو گیا۔ حضرت اسماء بنت عمیس کہتی ہیں: میں نے سورج کو ڈوبتے ہوئے اور دوبارہ طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔ سند کی کم زوریوں کے علاوہ روایت کا متن بھی قابل اعتراض ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر صحابہ کی عصر کی نماز قضا ہوئی تب تو سورج واپس نہ آیا۔ اگر یہ معجزہ حقیقتاً واقع ہوا ہوتا تو ایک مشہور واقعے کی طرح زبان زد عام ہوتا اور ہر مومن، ہر کافر اسے بیان کرتا۔ اس کے باوجود طحاوی نے اس روایت کی توجیہ کرنے کی کوشش کی (شرح مشکل الآثار: ۱۰۶۷)۔ حضرت اسماء کے علاوہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری سے بھی یہ واقعہ روایت کیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت اسماء کی وفات حضرت علی کی شہادت سے دو برس قبل ۳۸ھ میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی قبر دمشق کے مقبرۂ باب صغیر میں ہے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، دلائل النبوۃ (بیہقی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، سیر اعلام النبلا (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، کتاب العبر و دیوان المبتدأ والخبر (ابن خلدون)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

مقالات

رضوان اللہ

البیان

خصائص و امتیازات

(۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

الفاظ

لفظ معنی کے اِبلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ مخاطَب کی طرف سے دیکھا جائے تو یہ ابلاغ بہت کچھ اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ اُن کا مرادی معنی کیا صحیح طور پر متعین کر لیا گیا ہے یا نہیں؟ معمول میں یہ کام انتہائی درجے کی سادگی سے انجام پا جاتا ہے اور اس کے لیے کوئی مشقت اٹھانے کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس میں کچھ نزاکتیں در آتی ہیں[۴]، جن کا اگر لحاظ نہ رکھا جائے تو اس بات کا احتمال بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ ابلاغ کے عمل میں کوئی نقص یا اصل مدعا ہی سے قطعی انحراف واقع ہو جائے۔ قرآن بھی الفاظ سے تخلیق پانے

۴؎ جیسا کہ مثال کے طور پر لفظ کا اصل معنی زیادہ معروف نہ رہے اور ہم اس سے کوئی اور معنی مراد لے بیٹھیں۔ لفظ میں کوئی نیا معنی پیدا ہو جائے اور ہم اُسے ہی متکلم کا منشا قرار دے لیں۔ لفظ ایک سے زائد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہو اور ہم یہ نہ جان سکیں کہ متکلم نے ان میں سے کون سے معنی کا ابلاغ کرنا چاہا ہے۔ یا لفظ ایک جامع مفہوم کا حامل ہو اور ہمیں معلوم نہ ہو سکے کہ سیاق و سباق میں آ کر اس میں کیا تخصیص پیدا ہو گئی ہے۔

والا ایک کلام ہے، چنانچہ ضروری ہے کہ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اس طرح کی تمام باریکیوں کا خیال رکھا جائے اور اس کے الفاظ کا مرادی معنی معلوم کرنے میں بہت زیادہ اہتمام سے کام لیا جائے۔ ہم اس نظر سے جب ''البیان'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کچھ باتیں معنی کی تعیین کے اس کام میں اصل اصول کی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ باتیں وہ ہیں جو اطلاق کی حیثیت رکھتی ہیں، مگر وہ اِس کام کے طریق کو بالکل واضح کر دینے والی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم انھیں اصل اصول اور منہج و طریق کے دو الگ ناموں کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

اصل اصول

اصولی حیثیت کی یہ باتیں قرآن کے ہر ہر لفظ کے ترجمہ میں ملحوظ رکھی گئی ہیں اور یہ تعداد میں چند ایک ہیں، جیسا کہ معروف معنی، صحیح معنی اور قراءتِ عامہ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معروف معنی

قرآن واقعہ میں اور خود اپنی شہادت کے مطابق بھی عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔[5] یہ حقیقت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اُس کے الفاظ کا ترجمہ اُن کے معروف معنی کے لحاظ سے کیا جائے اور اس عمل میں کسی شاذ مفہوم کو ہرگز راہ نہ دی جائے کہ ایسا کرنا اصل میں اس کلام کی فصاحت اور بلاغت کا انکار کر دینا ہے۔ چنانچہ ''البیان'' میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ہر لفظ سے وہی معنی مراد لیا جائے جو اہل زبان کے ہاں معروف اور عام طور پر جانا پہچانا ہو۔ اس اصول کی مثال میں اس آیت کو دیکھ لیا جا سکتا ہے:

اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ. وَّالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ يَسۡجُدٰنِ. (الرحمٰن ۵۵: ۵-۶)	''سورج اور چاند ایک حساب سے گردش میں ہیں، اور تارے اور درخت، سب سجدہ ریز ہیں۔''

'النَّجۡم' سے مراد ستارے ہیں۔ یہاں اس سے بعض مترجمین نے بے تنے کے پودے اور جھاڑ وغیرہ مراد لیے ہیں۔ خاص اس آیت میں معمول سے ہٹ کر معنی لینے کی وجہ یہ ہوئی کہ اُن کے نزدیک ایک تو سورج اور چاند جیسی آسمانی نشانیوں کے بعد اب زمین کی نشانیوں کا ذکر ہے، اس لیے یہاں 'النَّجۡم' سے مراد زمین ہی کی کوئی چیز ہونی

---

[5] الشعراء ۲۶: ۱۹۵۔

چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اس کا 'الشَّجَر' کے ساتھ مذکور ہونا بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے مراد زمین پر پائے جانے والے پودے ہی مراد لیے جائیں اور مزید یہ کہ 'النَّجم' کا ایک مطلب لغت کی کتابوں میں بے تنے کے پودے پایا بھی جاتا ہے۔ اس کے مقابل میں جن حضرات نے اس کا ترجمہ ''ستارے'' کرنے پر اصرار کیا ہے، اُن کے نزدیک اس کی دلیل صرف یہ ہے کہ قرآن میں الگ سے ستاروں کے سجدہ ریز ہونے کا ذکر موجود ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ بعض علماے تفسیر کی بھی اس مقام پر یہی راے ہے۔ ''البیان'' میں بھی اس کا ترجمہ ''تارے'' کیا گیا ہے، مگر اس کی وجہ کچھ اور نہیں، بلکہ وہی اصول ہے جس کے مطابق ہر لفظ کا صرف معروف معنی مراد لیا جائے گا اور ہم جانتے ہیں کہ عربی زبان میں یہ معروف معنی ستاروں ہی کا ہے۔ باقی جہاں تک درختوں کے ساتھ ان کی مناسبت کا معاملہ ہے تو واضح رہے کہ اس طرح کی باتیں لفظ کی حقیقی مراد کو پالینے کے بعد ہی زیر بحث آنی چاہییں اور ''البیان'' میں یہ اسی ترتیب سے زیر بحث آتی بھی ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ذیل کی آیات بھی معروف معنی میں ترجمہ کرنے کی اچھی مثال ہیں اور ''البیان'' میں ان کا ترجمہ کرتے ہوئے 'اِبِل' سے اونٹ، 'بَیْض' سے انڈے اور 'اَنْحَرْ' سے مراد قربانی لی گئی ہے، نہ کہ بادل، انڈوں کی چھپی ہوئی جھلی اور سینے پر ہاتھ باندھنا جیسے شاذ مفاہیم:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ. (الغاشیہ ۸۸: ۱۷) ''(یہ نہیں مانتے) تو کیا اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے ہیں؟''

کَاَنَّهُنَّ بَیْضٌ مَّکْنُوْنٌ. (الصافات ۳۷: ۴۹) ''گویا کہ (شتر مرغ کے) چھپے ہوئے انڈے ہیں۔''

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ. (الکوثر ۱۰۸: ۲) ''اس لیے تم (اس بیت عتیق میں اب) اپنے پروردگار کی نماز پڑھنا اور اُسی کے لیے قربانی کرنا۔''

یہاں اس بات پر بھی توجہ رہے کہ کسی لفظ کا اہل زبان کے ہاں غیر معروف ہونا، ایک چیز ہے اور اس کا ہماری تفسیر کی کتابوں میں غیر معروف ہو کر رہ جانا، یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ مثال کے طور پر:

وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی. فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی. (الاعلیٰ ۸۷: ۴-۵) ''جس نے سبزہ نکالا، پھر اُسے گھنا سرسبز و شاداب بنا دیا۔''

'غُثَآءً اَحْوٰی' کا ترجمہ عام طور پر مترجمین ''سیاہ کوڑا'' کے الفاظ میں کرتے ہیں اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مفسرین کے ہاں ایک تسلسل سے ان الفاظ کا یہی معنی بیان کیا گیا، حتیٰ کہ خیال ہونے لگا کہ یہ اِن الفاظ کا

معروف معنی ہے حالاں کہ 'غُثَآء' کی حد تک تو صحیح ہے کہ یہ گھنی گھاس کے لیے بھی آجاتا ہے اور کوڑا کرکٹ اور خس و خاشاک کے لیے بھی، مگر 'اَحْوٰی' کا لفظ ہرگز اُس سیاہی کے لیے نہیں آتا جو کسی شے کی بوسیدگی اور پامالی کی وجہ سے اس پر آجاتی ہے، بلکہ یہ اُس سیاہی مائل سرخی اور سبزی کے لیے معروف ہے جو کسی شے پر اُس کی شادابی اور تازگی کے سبب سے نمایاں ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ 'اَحْوٰی' کے معروف معنی کا خیال رہے اور موصوف اور صفت کی باہمی مناسبت کا بھی دھیان رہے تو 'غُثَآءً اَحْوٰی' کا ترجمہ اب سیاہ کوڑا کرکٹ کرنے کے بجائے گھنا اور سرسبز و شاداب ہی کرنا چاہیے، جیسا کہ ''البیان'' میں کیا گیا ہے: ''پھر اُسے گھنا اور سرسبز و شاداب بنا دیا۔''

صحیح معنی

دوسری چیز جو ''البیان'' میں اصول کے طور پر ہر آیت کے ترجمے میں کارفرما نظر آتی ہے، وہ غلط معنی سے اجتناب اور صحیح معنی پر مترجم کا اصرار کرنا ہے۔[6] معنی کو صحیح قرار دینے کی ایک سے زائد بنیادیں ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر، قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں اتارا گیا ہے[7] اور ہم جانتے ہیں کہ آپ کی زبان وہی تھی جو اہل مکہ کے ہاں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ سو قرآن کے الفاظ کا صحیح مفہوم اب وہی ہوسکتا ہے جس سے اہل مکہ اور بالخصوص قریش کے لوگ واقف ہوں، نہ کہ وہ مفہوم جس کے لیے ہمیں کسی دوسرے مقام اور قبیلے کی زبان سے استدلال لانا پڑے۔ اور مزید یہ کہ وہ آپ کے زمانے میں سمجھا جانے والا مفہوم ہو، نہ کہ وہ بعد میں اس لفظ کے اندر کسی زمانے میں تولد ہوا ہو۔ اسی طرح مثال کے طور پر، ہمارے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہم قرآن کی اتباع کریں، چنانچہ اس لحاظ سے بھی اب صحیح مفہوم وہی ہوسکتا ہے جو قرآن کو موضوعی کے بجائے معروضی انداز میں دیکھنے کے نتیجے میں ہمارے سامنے آئے اور اس پر یہ بھی لازم ہوگا کہ اس عمل میں ہر طرح کی تحقیق اور گہرے غور و خوض کو بھی بروے کار لایا جائے کہ اس کے بغیر ممکن ہے کہ ہم کسی غلط معنی کو لفظ کی اصل مراد قرار دے بیٹھیں۔ چند آیتوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جن سے یہ اصول بالکل واضح ہو کر ہمارے سامنے آجائے گا:

۱۔ اہل مکہ کی زبان ہی اس معاملے میں صحیح اور غلط کا معیار ہے، اس کے لیے ذیل کی آیت کا ترجمہ دیکھ لیا جا سکتا

---

[6] یہاں یہ فرق واضح رہے کہ معروف کے مقابلے میں شاذ معنی اپنی حقیقت میں غلط نہیں ہوتا، بلکہ وہ عام طور پر استعمال میں نہیں لایا جاتا، لیکن اس دوسرے اصول کے مطابق جو معنی صحیح کے مقابلے میں آتا ہے، وہ اصل میں سرے سے غلط ہوتا ہے۔

[7] الدخان ۴۴: ۸۵۔

ہے:

قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيۡۤ اَرٰىنِيۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا. ''اُن میں سے ایک نے (ایک دن) اُس سے کہا:
(یوسف ۱۲: ۳۶) میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں۔''

سیدنا یوسف کے ساتھ قید دو آدمیوں نے آپ سے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھی۔ ایک نے کہا: میں خواب میں دیکھتا ہوں: 'اَعۡصِرُ خَمۡرًا' (میں خمر نچوڑ رہا ہوں)۔ یہ لفظ اہل مکہ کے ہاں شراب کے لیے عام استعمال ہوتا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی یہ اسی معنی میں آیا ہے، مگر بعض لوگوں کے ہاں جب یہ اُلجھن پیدا ہوئی کہ حقیقت میں تو شراب کے بجاے انگور نچوڑے جاتے ہیں تو اُنھوں نے اِس کا حل یہ نکالا کہ 'خَمۡر' کا ترجمہ یہ کہتے ہوئے انگور کر دیا کہ اسے عُمان میں رہنے والے لوگ اسی معنی میں بولا کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف، ''البیان'' میں اس اصول کی رعایت سے کہ ترجمہ ہمیشہ اہل مکہ کی زبان کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جائے گا، اسے انھی لفظوں میں ادا کیا گیا ہے کہ ''شراب نچوڑ رہا ہوں۔'' باقی جہاں تک 'شراب' کے لفظ میں کسی الجھن کے پیدا ہونے کی بات ہے تو جان لینا چاہیے کہ اس معاملے میں زبان کے ایک معروف قاعدے سے صرف نظر ہو گیا ہے جسے 'تسمية الشيء بما يؤول إليه' کہا جاتا ہے، یعنی غایت اور نتیجے کے اعتبار سے کسی لفظ کا استعمال کرنا۔ انگور نچوڑنے کی غایت اگر شراب بنانا ہے تو اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی موجود ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر ہم کہیں: ''مزدور کنواں کھود رہے ہیں۔'' حالاں کہ وہ زمین کھود رہے ہوتے ہیں کہ جس کا مقصد کنواں بنانا ہوتا ہے۔ ''درزی دلہا کا سوٹ سی رہا ہے۔'' حالاں کہ وہ کپڑے کے پارچے سی رہا ہوتا ہے کہ جس کا مقصد سوٹ تیار کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں: ''چکی آٹا پیس رہی ہے۔'' حالاں کہ وہ گندم پیس رہی ہوتی ہے کہ جس سے مقصود آٹا حاصل کرنا ہوتا ہے۔

۲۔ اس معاملے میں قریش کی زبان ہی اصل قرار پائے گی، اس کے لیے ''البیان'' میں کیا گیا اس آیت کا ترجمہ دیکھ لیا جا سکتا ہے:

وَنَادٰى نُوۡحُ ۨابۡنَهٗ. (ہود ۱۱: ۴۲) ''اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔''

بعض حضرات نے ایک خود ساختہ اعتراض سے بچنے کی غرض سے یہاں 'ابۡنَهٗ' کا ترجمہ 'ابن امرأته' کیا ہے، یعنی نوح نے اپنی بیوی کے بیٹے کو آواز دی اور اس کی دلیل میں کہا ہے کہ قبیلہ طیء کے لوگ 'ابۡنَهٗ' سے یہی معنی مراد لیتے ہیں، حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ قبیلہ طیء سے تعلق رکھتے تھے اور نہ قرآن ہی اُس قبیلے

کی زبان میں اتارا گیا تھا۔

۳۔لفظ کے اُسی مفہوم کو ترجمہ میں لکھا جائے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس سے سمجھا جاتا رہا ہو نہ کہ اُسے جو بعد میں کہیں جا کر اس کے اندر متولد ہوا ہو، اس کے لیے ذیل کی آیت کا ترجمہ غور طلب ہے:

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ. (آل عمران ۳:۷) ''دراں حالیکہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

فرمایا ہے کہ قرآن میں محکمات اور متشابہات، دونوں طرح کی آیات ہیں۔جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ متشابہات کے درپے ہوتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ فتنہ پیدا کریں اور اس کی حقیقت کو جان لیں، دراں حالیکہ اُن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔قرآن کے زمانۂ نزول میں لفظ 'تَاْوِيْل' کا اصل معنی کسی چیز کی حقیقت کو جان لینا تھا اور اس پر قرآن کے دیگر کئی مقامات بھی شاہد ہیں، چنانچہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ یہی لکھا گیا ہے اور اُن آرا سے ہرگز کوئی اعتنا نہیں برتا گیا جو اس کا معنی ''مطلب''، ''مراد'' اور ''تفسیر'' کرتے ہیں کہ یہ اس لفظ کے سراسر متولد مفاہیم ہیں۔[۸]

۴۔اسی طرح یہ بھی ''صحیح معنی'' کے اصول پر اصرار ہی ہے کہ ''البیان'' میں موضوعی کے بجاے معروضی انداز اپنایا گیا ہے۔سادہ لفظوں میں بیان کیا جائے تو موضوعی انداز اصل میں خارج کی بات کو قرآن میں داخل کر دینا ہے اور معروضی انداز سے مراد، قرآن کو اس کی اپنی صورت میں، جیسا کہ وہ ہے، دیکھنے کا التزام کرنا ہے۔اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک مثال کافی ہو سکتی ہے:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ. (آل عمران ۳:۵۵) ''اُس وقت جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اُٹھا لوں گا۔''

۸۔ بعض اوقات مترجمین لفظ کا معنی تو صحیح لکھ دیتے ہیں، مگر اس سے مراد متولد مفاہیم ہی لیتے ہیں۔جیسا کہ مثال کے طور پر ان آیتوں میں عالم، فقہ، امام اور روح کے الفاظ سے ایک مذہبی عالم، فقہ کا علم، امامت کا عقیدہ اور یونانی علم کا تصورِ روح مراد لے لینا: 'اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا' (فاطر ۳۵:۲۸)۔'فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ' (التوبہ ۹:۱۲۲)۔'يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ' (بنی اسرائیل ۱۷:۷۱)۔'قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ' (بنی اسرائیل ۱۷:۸۵)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خارج کے تناظر میں دیکھنے کے بجاے 'اگر تو فی' کے لفظ پر براہ راست غور کیا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ وہی بنتا ہے جو ''البیان'' میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں یہ لفظ اپنے مجازی معنی، یعنی وفات کے لیے اس قدر معروف ہو گیا ہے کہ اسے حقیقی معنی میں لینے کے لیے اب کسی قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی بعینہٖ مثال ہماری زبان میں لفظِ انتقال کی ہے۔ اس کے متعلق بھی ہم جانتے ہیں کہ یہ اپنے حقیقی معنی، یعنی منتقل ہونے کے بجاے اب اپنے مجازی معنی، یعنی وفات پا جانے میں زیادہ معروف ہو گیا ہے۔

یہاں ایک اور مثال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گا کہ ''البیان'' میں معروضی انداز پر اس قدر اصرار پایا جاتا ہے کہ لفظ تو لفظ، حرف کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اس پر کسی درجے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہوتا۔ مثلاً ذیل کی آیت میں حرف 'لَا' کا ترجمہ:

لِئَلَّا یَعۡلَمَ اَہۡلُ الۡکِتٰبِ اَلَّا یَقۡدِرُوۡنَ عَلٰی شَیۡءٍ مِّنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ وَاَنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ. (الحدید ۵۷: ۲۹)

''تاکہ یہ اہل کتاب نہ جانیں کہ اللہ کے فضل پر اُن کا کوئی اجارہ نہیں ہے اور یہ کہ اللہ کا فضل اُس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے۔''

عام طور پر مترجمین نے 'لِئَلَّا' کے 'لَا' کو زائد قرار دے کر اس کا ترجمہ نہیں کیا کہ اُن کی دانست میں یہاں اس کا ترجمہ کرنا ایک طرح کے ابہام اور الجھاو کو پیدا کر دینا ہے۔ ''البیان'' میں اس طرح کے ہر اندیشے سے قطع نظر، حرف 'لَا' کا ترجمہ ''نہیں'' کے لفظ میں کیا گیا ہے کہ یہی اس کا صحیح معنی ہے اور اسے زائد قرار دینا اصل میں نفی کو اثبات میں بدل دینا اور اس طرح غلط معنی کو اختیار کر لینا ہے۔ باقی جہاں تک کسی اِبہام کا تعلق ہے تو ''نہیں'' کے اس ترجمے کے بعد بھی یہاں اصل بات بالکل واضح ہے۔ یہ اہل کتاب سے بے زاری کا جملہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ اسی بات کے سزاوار ہیں کہ حقیقت حال سے کبھی واقف نہ ہوں اور یونہی اپنے آپ کو اللہ کے انعامات کا تنہا حق دار سمجھتے رہیں اور نتیجے کے طور پر اُس کے انعامات سے یک سر محروم ہو کر رہ جائیں۔

۵۔ اس سارے عمل میں عمیق غور و فکر اور ہر طرح کی تحقیق کو بروے کار لانا بھی لازم ہے، اس کے لیے ذیل کی آیت کے ترجمہ میں اچھی دلیل موجود ہے:

اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَی اللّٰہِ فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُکُمَا. (التحریم ۶۶: ۴)

''اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمھارے لیے زیبا ہے، تمھارے دل تو اِس کے لیے مائل ہی ہیں۔''

یہاں 'صغو' کا لفظ آیا ہے، جس کا معنی ہے: مائل ہونا اور جھک جانا۔ عام طور پر مترجمین نے اس میلان سے

حق بات سے دور ہو جانا مراد لیا ہے۔ اُن کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی کی بیبیو، اگر تم توبہ کرو تو تمھیں یہی کرنا چاہیے، اس لیے کہ تمھارے دل تک کج ہو چکے ہیں۔ اس کے برخلاف، ''البیان'' میں اس 'صغو' کا ترجمہ تو مائل ہونا ہی کیا گیا ہے، مگر اس میں پائے جانے والے باریک فرق کا لحاظ رکھتے ہوئے اس سے کسی شے سے انحراف کرنا نہیں، بلکہ اُس کی طرف جھکنا اور مائل ہو جانا مراد لیا گیا ہے، اس لیے کہ عربی زبان میں یہ اسی معنی میں آتا ہے۔[9]

قراءت عامہ

قرآن کے زمانۂ نزول میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا گیا تھا کہ اس وقت جو قراءت کی جارہی ہے، جمع و تدوین ہو جانے کے بعد اس کی جگہ ایک اور قراءت جسے ''عرضۂ اخیرہ'' کی قراءت کہتے ہیں، دی جائے گی۔ اور یہ بھی فرما دیا گیا کہ آپ کو بہرصورت اُسی کی پیروی کرنی ہے۔[10] اور ہم جانتے ہیں کہ یہی قراءت ہے جسے بعد میں ''قراءت عامہ'' کہا گیا اور جسے امت کا اجماع اور قولی تواتر بھی حاصل ہوا۔ ''البیان'' میں قرآن کے اس حکم کی وجہ سے یہ بھرپور التزام کیا گیا ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ قراءت عامہ ہی کی روشنی میں کیا جائے، جیسا کہ مثال کے طور پر یہ آیت:

وَلَا یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ فِیۡ سَمِّ الۡخِیَاطِ. (الاعراف ۷: ۴۰)

''اور وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوں گے، جب تک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے۔''

حق کے مقابلے میں استکبار کرنے والوں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ وہ ہرگز جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ فِیۡ سَمِّ الۡخِیَاطِ' (یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے)۔ عربی زبان میں 'الجَمَل' سے اونٹ مراد لیا جاتا ہے، مگر بعض حضرات جب سوئی کے ناکے اور اونٹ کے درمیان میں پائی جانے والی مناسبت کو سمجھ لینے سے قاصر رہے تو اُنھوں نے اسے 'الجُمَّل' پڑھا اور اس سے ''موٹا رسا'' مراد لے لیا۔ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ بہرصورت اونٹ ہی کیا جانا تھا کہ یہاں مترجم کے نزدیک قراءت عامہ ہی اصل قرآن ہے اور اس کو بدلنا گویا قرآن کو بدل دینا ہے۔ رہا سوئی کے ناکے کے ساتھ اس کی مناسبت کا سوال تو اصل میں تعلیق بالمحال کے اسلوب کا تقاضا ہے کہ سوئی کے ناکے جیسی چھوٹی چیز کے مقابلے میں یہاں ایک بڑی چیز کا بیان

9۔ صحیح معنی تک اس رسائی سے یہ بات بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ازواج مطہرات کی تنقیص کے بجائے اُن کے لیے خدا کی طرف سے اتارا گیا ایک تحسین کا جملہ ہے۔

10۔ القیامہ ۷۵: ۱۷-۱۸۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کیا جائے جو کسی بھی صورت اس میں سے نہ گزر سکے۔ اب عربوں کی معاشرت اور اُن کے مزاج کی رعایت رہے تو اتنی بڑی اور گزر جانے والی یہ چیز آخر اونٹ کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے[11]؟

ذیل کی آیت بھی قراءت عامہ کے مطابق ترجمہ کرنے کی ایک اچھی مثال ہے:

لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ. (آل عمران ۳: ۱۶۴)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا ہے کہ اُن کے اندر خود اُنھی میں سے ایک رسول اٹھایا ہے۔''

یہاں 'مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ' کا لفظ آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''خود اُنھی میں سے''، یعنی مسلمانوں میں سے ہیں۔ بعض حضرات نے ایک اعتراض سے بچنے کے لیے جو حقیقت میں کوئی اعتراض نہیں ہے، اسے 'اَنۡفَسِهِمۡ' پڑھا ہے، یعنی وہ اُن کے شریف اور عمدہ لوگوں میں سے ہیں۔ ''البیان'' کے اصول کا تقاضا ہے کہ اس لفظ کا ترجمہ بہر حال قراءت عامہ کے مطابق کیا جائے اور وہ یہی بنتا ہے کہ رسول اللہ ''خود اُنھی میں سے'' ہیں۔ اس ترجمہ کے بعد اب اس کا مطلب بھی آسانی سے سمجھ لیا جا سکتا ہے۔ یہاں مسلمانوں پر جس احسان کا ذکر ہو رہا ہے، وہ اصل میں اپنی کامل صورت میں اُسی وقت سامنے آتا ہے جب یہ کہا جائے کہ اللہ کے رسول اُن کے لیے کوئی اجنبی آدمی نہیں ہیں کہ اسلام کی دعوت میں کسی ابہام کے رہ جانے اور اس طرح اُن کے نامراد ہو جانے کا کوئی امکان ہو، بلکہ وہ اُنھی میں سے ہیں، یعنی ملائکہ اور جنوں میں سے ہونے کے بجائے اُنھی کی طرح کے ایک انسان ہیں، انھی کی معاشرت میں جینے والے اور مزید یہ کہ اُنھی کی زبان میں اُن سے کلام کرنے والے ہیں۔

منہج وطریق

بعض باتیں اصولی حیثیت نہیں رکھتیں اور ہر مقام پر الگ سے اپنائی گئی ہیں، مگر اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں کہ وہ معنی کی تعیین کے طریقۂ کار کو بالکل واضح کر دینے والی ہیں، جیسا کہ لفظ کی ساخت، لفظ کے عوارض، دیگر الفاظ، سیاق و سباق اور عرف و نظائر۔

---

[11] اہل عرب کا یہی مزاج تھا کہ ایک سریہ میں بہت بڑی مچھلی صحابۂ کرام کے ہاتھ لگی۔ اُن کے امیر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کی پسلی کی ہڈی کو کھڑا کیا اور ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ اونٹ پر سوار ہو کر اس کے نیچے سے گزرے (بخاری، رقم ۴۳۶۱)۔

لفظ کی ساخت

عربی زبان میں لفظ کی کنسٹرکشن معنی و مفہوم پر اچھا خاصا اثر رکھتی ہے۔ تراجم میں بالعموم اس کی رعایت کی جاتی ہے، مگر اس سے بعض معانی ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جو بسا اوقات نظر انداز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت ایک سے زائد عنوانات کے تحت کی جا سکتی ہے، مثلاً:

۱۔ مصدر اور اُس کے مشتقات

يُطَافُ عَلَيۡهِمۡ بِكَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِيۡنٍۭ. بَيۡضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ. (الصافات ۳۷: ۴۵-۴۶)

''اُن کے لیے شراب ناب کے جام گردش میں ہوں گے۔ بالکل صاف شفاف، پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت۔''

یہ اہل جنت کو دی جانے والی نعمتوں کا بیان ہے کہ اُنھیں شراب خالص کے جام دیے جا رہے ہوں گے۔ وہ دیکھنے میں صاف شفاف اور پینے والوں کے لیے 'لَذَّة' ہوں گے۔ یہاں 'لَذَّة' اصل میں مصدر ہے اور صفت کے مفہوم میں آیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جب مصدر صفت کے مفہوم میں استعمال ہو تو اُس میں ایک طرح کا مبالغہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس لفظ کا ترجمہ صرف ''لذت'' یا ''لذیذ'' کرنے کے بجائے ''لذت ہی لذت'' کیا گیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن میں اس کی اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں، جیسا کہ یہ آیت:

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖۤ اِنَّنِىۡ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعۡبُدُوۡنَ. (الزخرف ۴۳: ۲۶)

''یاد کریں جب ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا تھا کہ جنھیں تم پوجتے ہو، میں اُن سے بالکل بری ہوں۔''

یہاں بھی مصدر 'بَرَآءٌ' صفت کے مفہوم میں آیا ہے اور ''البیان'' میں اس سے پیدا ہو جانے والے مبالغے کو ''بری ہوں'' کے ساتھ ''بالکل'' کا لفظ لا کر ادا کیا گیا ہے۔

بعض اوقات مصدر ترجمے میں تاکید کا معنی بھی پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں:

كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ ؕ وَعۡدًا عَلَيۡنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيۡنَ. (الانبیاء ۲۱: ۱۰۴)

''ہم نے جس طرح پہلی خلقت کی ابتدا کی تھی، اُسی طرح ہم اُس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ہمارے ذمے ایک حتمی وعدہ ہے، ہم اس کو ضرور کر کے رہیں گے۔''

اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے عام طور پر مترجمین سے 'وَعْدًا' کا مصدر موکّد ہونا نظر انداز ہو گیا ہے۔ ''البیان'' میں اس کی پوری رعایت کی گئی ہے اور ترجمے میں اس کے لیے ''حتمی'' کا لفظ لایا گیا ہے۔

ترجمے میں مصدر کی طرح اس کے مشتقات کا معاملہ بھی بڑا غور طلب ہوتا ہے۔ جیسا کہ مثال کے طور پر اسم فاعل کا:

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ. (المومن ۴۰:۵۹)

''یہ بالکل قطعی ہے کہ قیامت آ کے رہے گی، اِس میں کوئی شک نہیں، مگر اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں۔''

یہاں قیامت کے بارے میں فرمایا ہے: 'لَاٰتِيَةٌ'۔ یہ اسم فاعل ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قدیم عربی زبان میں فاعل کا وزن فعل میں زور لانے اور قطعیت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی لایا جاتا ہے۔ بالعموم اردو کے مترجمین اس سے زیادہ واقف نہیں ہیں، مگر ''البیان'' کے مذکورہ ترجمے میں اسے بیان کرنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔

یہ فاعل جس طرح اللہ کی طرف سے کیے گئے وعدے کی قطعیت کے لیے آیا ہے، اسی طرح بعض اوقات یہ اُس کے عزم جازم اور حتمی فیصلے کے لیے بھی آ جاتا ہے۔ اس کے لیے ذیل کی آیتوں کو دیکھ لیا جا سکتا ہے جن میں 'جٰعِلُوْنَ' اور 'فٰعِلِيْنَ' کے الفاظ میں پائے جانے والے اس مفہوم کو اردو میں مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا. (الکہف ۱۸:۸)

''ہم اُن سب چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ایک دن بالکل نابود کر کے اُس کو) ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں۔''

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ. (الانبیاء ۲۱:۱۰۴)

''ہم نے جس طرح پہلی خلقت کی ابتدا کی تھی، اُسی طرح ہم اُس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ہمارے ذمے ایک حتمی وعدہ ہے، ہم اس کو ضرور کر کے رہیں گے۔''

ذیل کی آیت میں 'كُنَّا مُرْسِلِيْنَ' بھی فاعل کے وزن سے بنا ہوا 'كُنَّا فٰعِلِيْنَ' کی طرح کا اسلوب ہے جو خدا کے حتمی فیصلہ کو بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے:

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ. (القصص ۲۸:۴۵)

''تم مدین والوں کے درمیان بھی موجود نہ تھے، اُن کو ہماری آیتیں سناتے ہوئے، لیکن ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ تمھیں رسول بنائیں۔''

فاعل کی طرح مفعول کے وزن کا بھی یہی معاملہ ہے، یہ بھی اپنے اندر ایک طرح کی تاکید اور قطعیت رکھتا ہے۔ دیگر ترجموں کے برعکس، ''البیان'' میں اس کی بھی پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے، جیسا کہ ذیل کی آیت میں 'مَفْعُوْلًا'

کا ترجمہ محض ہو جانے والی بات نہیں کیا، بلکہ اس میں پائی جانے والی حد درجہ قطعیت کو بھی بیان کیا ہے:

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا. (النساء۴: ۴۷) ''اور (یاد رکھو کہ) خدا کی بات ہو کر رہتی ہے۔''

اسم تفضیل عام طور پر دوسروں کے مقابلے میں مصدری معنی کی زیادتی کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے، لیکن یہ بعض اوقات ہر طرح کے تقابل سے مجرد ہو کر بھی آجایا کرتا ہے:

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ. (سبا۳۴: ۳۹) ''اُس کی راہ میں جو چیز بھی تم خرچ کرو گے، وہ اُس کا صلہ دے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔''

دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ 'خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ' کا ترجمہ ''سب سے بہتر رزق دینے والا'' کرنے کے بجائے ''بہترین رزق دینے والا'' کیا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں اسم تفضیل، یعنی 'خَيْر' کا لفظ کسی طرح کی ترجیح کے مفہوم میں نہیں، بلکہ محض بیان صفت کے لیے آگیا ہے۔

اسم صفت بھی بعض مقامات پر کچھ خاص معنی ادا کرتا ہے:

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ. (البقرہ۲: ۸۳) ''پھر تم میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب (اُس سے) پھر گئے اور حقیقت یہ ہے کہ تم پھر جانے والے لوگ ہی ہو۔''

یہاں فعل 'تَوَلَّيْتُمْ' کے بعد 'مُعْرِضُوْنَ' کی صفت آئی ہے۔ فعل کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ اپنے اندر ایک طرح کا حدوث رکھتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں صفت کے اندر کسی چیز کے مستقل وصف اور خصلت ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ''البیان'' میں 'تَوَلَّيْتُمْ' کا ترجمہ ''پھر گئے'' کیا گیا ہے جو محض وقوع پذیر ہونے والے ایک فعل کا بیان ہے، مگر 'مُعْرِضُوْنَ' کا ترجمہ ''تم پھر جانے والے لوگ ہی ہو'' کیا گیا ہے جو اُن لوگوں کے کردار کے ایک مستقل پہلو کو بیان کر رہا ہے۔

۲۔ صیغوں کا اختلاف

صیغوں کے بدل جانے سے بھی لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ عام طور پر تثنیہ کا صیغہ دو اور جمع کا صیغہ تین اور اس سے زائد افراد کے لیے لایا جاتا ہے، مگر ہم جانتے ہیں کہ بعض اوقات ان صیغوں سے کچھ اور معانی کا ابلاغ بھی پیش نظر ہوتا ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ. ''وہی مشرق کا رب ہے، اُس کے دونوں کناروں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تک، اور وہی مغرب کا رب ہے، اُس کے دونوں کناروں تک۔'' (الرحمٰن ۵۵: ۱۷)

اس آیت میں 'اَلۡمَشۡرِقَیۡنِ' اور 'اَلۡمَغۡرِبَیۡنِ' تثنیہ کی صورت میں آئے ہیں۔ مترجمین نے ان کا ترجمہ 'دو مشرق' اور 'دو مغرب' کے الفاظ میں کیا ہے اور اس سے بالعموم گرمی اور سردی کے مشرق مراد لیے ہیں۔ دراں حالیکہ عربی زبان میں تثنیہ کسی چیز کے دونوں کناروں کو بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ''اُس کے دونوں کناروں تک'' کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

ذیل کی آیت بھی اس کی ایک اچھی مثال ہے جس میں 'صَدَفَیۡنِ' کے تثنیہ سے اصل میں پہاڑوں کے درمیان خلا کے دونوں کناروں کو بیان کرنا مقصود ہے:

حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ قَالَ انۡفُخُوۡا. ''یہاں تک کہ جب اُس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا کو پاٹ دیا تو کہا کہ دھونکو۔'' (الکہف ۱۸: ۹۶)

جمع کا صیغہ بھی بعض اوقات جمع کے بجاے وسعتِ اطراف کو بیان کرنے کے لیے آجاتا ہے:

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَ الۡمَغٰرِبِ. ''سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جو مشرق و مغرب کی تمام وسعتوں کا مالک ہے۔'' (المعارج ۷۰: ۴۰)

اس آیت میں 'اَلۡمَشٰرِق' اور 'اَلۡمَغٰرِب' جمع کے صیغے ہیں۔ ان کا ترجمہ اکثر مترجمین نے ''مشرقوں'' اور ''مغربوں'' کے الفاظ میں کیا ہے اور اس سے سورج کے مختلف مطالع اور مغارب کو مراد لیا ہے۔ ''البیان'' میں جمع کے اس خاص پہلو کا لحاظ کرتے ہوئے کہ یہ بعض اوقات کسی شے کے اطراف کی وسعت کو بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے، اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''جو مشرق و مغرب کی تمام وسعتوں کا مالک ہے۔''

قرآن میں جمع کا صیغہ اس کے علاوہ بھی کئی مفاہیم کے پیش نظر استعمال کیا جاتا ہے:

فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَيۡهِمۡ حَسَرٰتٍ. ''سو اِن پر افسوس کر کر کے تم اپنے کو ہلکان نہ کرو۔'' (فاطر ۳۵: ۸)

یہاں 'حَسَرٰت' کے لفظ کی جمع اصل میں اُن لوگوں پر کیے جانے والے غم اور افسوس کی شدت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ''افسوس کر کر کے'' کے الفاظ لائے گئے ہیں اور ان میں ''کر'' کی تکرار درحقیقت افسوس کی اسی شدت کو ظاہر کرنے کی ایک کوشش ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بعض اوقات جمع کا صیغہ کسی شے کے وجود کو بیان کرنے کے لیے بھی آجایا کرتا ہے:

فَاِنۡ کَانَ لَہٗۤ اِخۡوَۃٌ فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ یُّوۡصِیۡ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ. (النساء ۴:۱۱)

''لیکن اُس کے بھائی بہن ہوں تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ ہے (اور باپ کے لیے بھی وہی چھٹا حصہ)۔ یہ حصے اُس وقت دیے جائیں، جب وصیت جو اُس نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض، (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے۔''

اس آیت میں 'اِخۡوَۃ' جمع کا صیغہ ہے، چنانچہ مترجمین نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ''کئی بھائی'' یا ''ایک سے زیادہ بھائی یا بہن'' وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''البیان'' میں اس کے لیے محض ''بھائی بہن'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں 'اِخۡوَۃ' جمع کی صورت میں ہونے کے باوجود بیان عدد یا بیان نوع کے لیے نہیں، بلکہ محض بیان وجود کے لیے آیا ہے۔ جمع کا یہ استعمال ہماری زبان میں بھی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم کسی دوست کو گاڑی میں جاتے دیکھیں اور وقت ملاقات اُس سے کہیں: ''بڑے مزے ہو رہے ہیں، جناب گاڑیوں میں پھرتے ہیں۔'' یہاں 'گاڑیوں' کا لفظ جمع کی صورت میں آیا ہے، مگر اس سے ہماری مراد نہ گاڑیوں کی تعداد بتانا ہے اور نہ اُن کی کسی مخصوص قسم کا تذکرہ کرنا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ماضی اور مضارع کے صیغے بھی عمومی معنی کے ساتھ ساتھ کچھ مزید معانی کا ابلاغ کرتے ہیں:

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ. (الکوثر ۱۰۸:۱)

''ہم نے یہ خیر کثیر تمھیں عطا کر دیا ہے، (اے پیغمبر)۔''

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو 'الۡکَوۡثَر' دیے جانے کی خوش خبری سنائی جا رہی ہے، مگر اس کے لیے ماضی کا صیغہ لایا گیا ہے۔ گویا یہ مستقبل میں ہونے والا واقعہ خدا کے ہاں اس قدر حتمی ہے کہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ابھی سے واقع میں آچکا۔ ''البیان'' میں دیگر مترجمین کی طرح 'اَعۡطَیۡنَا' کا ترجمہ فعل ماضی میں کیا گیا ہے، مگر اس کے بعد والے جملوں میں ''تم اپنے پروردگار کی نماز پڑھو اور اُسی کے لیے قربانی کرو'' کہنے کے بجائے ''تم اپنے پروردگار کی نماز پڑھنا'' اور ''اُسی کی قربانی کرنا'' کے الفاظ لائے گئے ہیں اور اسلوب کی اس تبدیلی سے پیش نظر یہی ہے کہ 'اَعۡطَیۡنَا' کا فعل ماضی وعدے کی قطعیت کو تو ضرور بیان کرے، مگر اگلے جملوں میں ''کرنا'' یہ بھی بتا دے کہ بہرکیف یہ مستقبل میں پوری ہونے والی ایک بشارت ہی ہے۔

وَنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡوَعِیۡدِ.

''اور (وہ دیکھو) صور پھونکا گیا۔ یہ وہی دن ہے

جس کی وعید ہم نے تمھیں سنائی تھی۔‘‘ (ق ۵۰: ۲۰)

یہاں بھی قیامت کے احوال کا ماضی کے صیغے میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود ایک بات تو وہی ہے کہ خدا کے وعدوں کی قطعیت کو بیان کیا جائے، مگر اس سے مقصود دوسری بات یہ ہے کہ اُن احوال کو قاری کی آنکھوں کے سامنے مصور بھی کر دیا جائے۔ ’’البیان‘‘ میں ’نُفِخَ‘ کا ترجمہ کرتے ہوئے اس دوسری بات کی بھی رعایت کی گئی ہے اور اس غرض سے ’’وہ دیکھو‘‘ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

ماضی کی طرح مضارع بھی بعض اوقات کچھ خاص معنی ادا کرتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں یہ استمرار کا بیان کر رہا ہے:

وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ. (البقرہ ۲: ۲۵۱)

’’اور اللہ نے اُسے بادشاہی دی اور حکمت عطا فرمائی اور اُسے اُس علم میں سکھایا جو اللہ چاہتا ہے (کہ اپنے اس طرح کے بندوں کو سکھائے)۔‘‘

یہاں ’عَلَّمَهٗ‘ کے فعل ماضی کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ’مِمَّا شَآءَ‘ ہوتا، مگر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے بجائے مضارع، یعنی ’مِمَّا يَشَآءُ‘ لایا گیا ہے۔ دراصل، اللہ نے نہیں چاہا کہ علم کی اس نعمت کا بیان حضرت داؤد سے مخصوص ہو کر رہ جائے، بلکہ اُس نے چاہا ہے کہ وہ اسے اپنی ایک مستقل سنت کی حیثیت سے بیان کرے۔ چنانچہ ’’البیان‘‘ میں ’مِمَّا يَشَآءُ‘ کا ترجمہ مضارع میں کرنے کے بعد اس سے پیدا ہونے والے استمرار کے مفہوم کو بھی قوسین میں کھول دیا گیا ہے۔

۳۔ ابواب کی خاصیات

عربی زبان میں لفظ مختلف ابواب میں کنسٹرکٹ ہوتا ہے۔ اس سے بھی اس کے معنی میں بعض خاصیات پیدا ہو جاتی ہیں اور ترجمہ کرتے ہوئے ضروری ہوتا ہے کہ ان کا خصوصی طور پر لحاظ رکھا جائے:

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ. (البقرہ ۲: ۹)

’’وہ اللہ اور اہل ایمان، دونوں کو فریب دینا چاہتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ ہی کو فریب دے رہے ہیں۔‘‘

اس آیت میں ’يُخٰدِعُوْنَ‘ اور ’يَخْدَعُوْنَ‘ کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مترجمین نے عام طور پر ان دونوں کا ترجمہ ایک جیسا کیا ہے، یعنی دھوکا اور فریب دینا، حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی مقام پر دو مختلف ابواب سے

فعل آ جائیں تو ان کا ایک جیسا ترجمہ کر دینا کچھ زیادہ موزوں نہیں۔ ''البیان'' میں 'خدع' اور 'مخادعة' کا ترجمہ مختلف طریقے سے کیا گیا ہے، یعنی 'خدع' سے مراد فریب دینا اور 'مخادعة' سے مراد فریب دینے کی کوشش کرنا۔[۱۲] اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس ترجمے سے وہ ساری بحثیں آپ سے آپ ختم ہو گئی ہیں جو تفسیر کی کتابوں میں اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔

فَلَمَّا رَاَيۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَقَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ. (الیوسف ۱۲: ۳۱)

''پھر جب عورتوں نے اُس کو دیکھا تو اُس کی عظمت سے مبہوت ہو گئیں اور (اپنی بات اُس سے منوانے کے لیے) اپنے ہاتھ جگہ جگہ سے زخمی کر لیے۔''

اصل میں 'قَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور اس سے مراد یہ لی گئی ہے کہ وہ عورتیں سیدنا یوسف کے کردار کی عظمت کو دیکھ کر اس قدر مبہوت ہوئیں کہ اپنے ہاتھوں کو کاٹ بیٹھیں، دراں حالیکہ یہاں 'قَطَّعۡنَ' اصل میں 'قطع' سے تفعیل ہے جس میں تکثیر کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ ''البیان'' میں تفعیل کی رعایت سے یوں ترجمہ کیا گیا ہے: ''اپنے ہاتھ جگہ جگہ سے زخمی کر لیے۔''[۱۳] اور اس سے مترجم کی مراد یہ ہے کہ ہاتھوں کا کٹنا بے خودی کی کیفیت میں ہو جانے والا کوئی واقعہ نہیں تھا، بلکہ یہ مصر کی بیگمات کی طرف سے کیا جانے والا ایک شعوری اِقدام تھا کہ وہ اپنے اس جذباتی مظاہرے سے سیدنا یوسف کو کسی طرح سے رام کر سکیں۔

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ. (النساء ۴: ۲۳)

''اور تمھاری وہ مائیں بھی جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا اور رضاعت کے اس تعلق سے تمھاری بہنیں بھی۔''

نکاح کے لیے حرام رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تمھاری وہ مائیں بھی تم پر حرام ہیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا۔ اس کے لیے 'اَرۡضَعۡنَكُمۡ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ باب اِفعال سے ہے جس کی خاصیات میں مبالغہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ ''البیان'' کے ترجمے میں مبالغے کے اس بیان کے لیے اردو کے اس جملے کو کافی سمجھا گیا ہے کہ ''تمھاری وہ مائیں بھی جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا''۔ البتہ، تشریحی نوٹ میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ رضاعت کسی کو اتفاقاً دودھ پلا دینے سے قائم نہیں ہو جاتی، بلکہ ضروری ہے کہ یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اور ایک

۱۲؎ یہ 'مخادعة' باب مفاعلہ سے ہے اور مبالغہ کے لیے آیا ہے اور موقع کلام بتا رہا ہے کہ یہ مبالغہ اصل میں فریب دینے کی کوششوں میں کیا جا رہا ہے۔

۱۳؎ یہاں تکثیر کے پہلو کو ترجیح کیوں دی گئی ہے، اس کی وضاحت کے لیے ''البیان'' کے حواشی کی مراجعت کر لی جا سکتی ہے۔

مقصد کی حیثیت سے عمل میں آئے۔

لفظ کے عوارض

لفظ کی ساخت کے ساتھ دوسری اہم چیز اس پر آنے والے عوارض ہیں۔ یہ معنی و مفہوم پر اچھا خاصا اثر انداز ہوتے اور معنی کی تعیین کے اس کام میں بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہم ان میں سے صرف چند ایک کا یہاں ذکر کرتے ہیں:

ا۔ الف لام کا آنا

عربی زبان میں اسم پر الف لام بھی آتا ہے جس کا ایک مقصد کسی چیز کو نکرہ کی حیثیت سے نکال کر اسے معرفہ بنا دینا ہوتا ہے۔ تراجم میں عام طور پر اس کی رعایت کی جاتی ہے، مگر اسے بعض مقامات پر سمجھنا اس قدر دقیق ہوتا ہے کہ یہ سرے سے نظر انداز ہو جاتا ہے۔ یا کسی مقام پر یوں ہوتا ہے کہ یہ عہد کے لیے لایا گیا ہوتا ہے، مگر اسے جنس کا قرار دے دیا جاتا ہے۔ یا کسی مقام پر عہد ذہنی کے لیے لایا گیا ہوتا ہے اور اسے عہد خارجی کا سمجھ کر ترجمہ کر دیا جاتا ہے یا معاملہ بعض اوقات اس سے اُلٹ بھی ہو جاتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں اس بات کا اِمکان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ قاری پر متکلم کی اصل منشا بالکل بھی واضح نہ ہو سکے:

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا. (الاحزاب ۳۳:۳۳)

’’اللہ تو یہی چاہتا ہے، اِس گھر کی بیبیو کہ تم سے وہ گندگی دور کرے (جو یہ منافق تم پر تھوپنا چاہتے ہیں) اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔‘‘

اس آیت میں ’الرِّجۡس‘ کا لفظ آیا ہے۔ مترجمین نے عام طور پر اس کے الف لام کو جنس کا قرار دیا اور ’’گندی باتیں‘‘، ’’ہر قسم کی گندگی‘‘ اور ’’ہر طرح کی ناپاکی‘‘ وغیرہ کے الفاظ میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ہے، اس ترجمہ کے بعد بہت سی غیر متعلقہ بحثیں آپ سے آپ پیدا ہو گئیں اور بعد ازاں مستقل عقیدوں میں ڈھل گئی ہیں، دراں حالیکہ اس مقام پر ازواج مطہرات کو دیے جانے والے خصوصی احکام کے پیش نظر اصل میں اُنھیں منافقین کی ریشہ دوانیوں سے بچانا ہے جو اس قدر زیادہ ہو گئی ہیں کہ وہ اُن پر اب اخلاقی الزامات لگانے کی بھی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ’الرِّجۡس‘ کا الف لام عہد کے لیے ہے اور اُس گندگی کو بیان کر رہا ہے جو ان الزامات کے ذریعے سے یہ لوگ ازواج مطہرات پر تھوپ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ’’البیان‘‘ کے ترجمے میں بھی اسے جنس کے بجائے عہد کا قرار

دیا گیا ہے اور اس عہد کو کھولنے کے لیے ''وہ گندگی'' کے الفاظ اور پھر قوسین کے اندر اس کی وضاحت میں یہ جملہ بھی لکھ دیا گیا ہے: ''جو یہ منافق تم پر تھوپنا چاہتے ہیں''۔ دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں کتاب اللہ کی یہ بات بہت واضح اور ہر طرح کے غل و غش سے پاک ہو کر ہمارے سامنے آ گئی ہے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ. (التوبہ ۹:۵)

''(بڑے حج کے دن) اِس (اعلان) کے بعد جب حرام مہینے گزر جائیں تو اِن مشرکوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو۔''

یہاں اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ 'الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ' کا الف لام عہد کے لیے ہے یا جنس کے لیے؟ بلکہ کم و بیش سب مترجمین کے نزدیک یہ عہد کے لیے ہے۔ البتہ، اختلاف اس امر میں ہے کہ اسے عہد خارجی کا سمجھا جائے یا عہد ذہنی کا۔ اکثر مترجمین اسے عہد خارجی کا قرار دیتے اور اس کا مطلب آیت ۲ کی روشنی میں یہ بیان کرتے ہیں کہ منکرین کو جن چار مہینوں کی مہلت دی گئی تھی، اصل میں یہ وہی چار مہینے ہیں۔ اس کے برخلاف، بعض حضرات کے ہاں یہ الف لام عہد ذہنی کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشہر حرم کی تعبیر اسم اور علم کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور اس سے ہٹانے کے لیے یہاں کوئی وجہ بھی موجود نہیں ہے، اس لیے عربیت کی رو سے اس پر آنے والا الف لام اب عہد ذہنی ہی کا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس سے مراد وہی چار مہینے ہیں جنھیں اصطلاح میں حرام مہینے کہا جاتا ہے، یعنی رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ اب ظاہر سی بات ہے کہ براءت کا اعلان اگر حج کے موقع پر کیا جائے تو اس کے بعد حرام مہینوں میں سے تقریباً پچاس دن باقی رہ جاتے ہیں۔ ''البیان'' میں اسی رائے کو اختیار کیا گیا ہے اور حاشیہ میں اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ. (النور ۲۴:۸)

''(اس کے بعد) عورت سے سزا اُسی صورت میں ٹل سکتی ہے کہ (اِس کے جواب میں) وہ بھی چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔''

مذکورہ بالا آیت کے مقابلے میں یہاں معاملہ بالکل اُلٹ ہے۔ یہ لعان کے متعلق ایک ہدایت ہے اور اس میں 'الْعَذَاب' کا الف لام معہود ذہنی کے بجائے معہود خارجی کا ہے جس کا بیان آیت ۲ میں 'عَذَابَهُمَا' کے لفظ میں موجود ہے۔ ''البیان'' میں بھی اسے عہد خارجی کا قرار دیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عربی زبان میں اگر معرفہ کا اعادہ معرفہ کی صورت میں کیا جائے اور کوئی قرینہ بھی مانع نہ ہو تو دوسرا بالکل پہلا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شادی شدہ

عورت کو دی جانے والی سزا بھی بعینہٖ وہی ہو گی جو اس سے پہلے 'عَذَابَھُمَا' کے الفاظ میں، یعنی سو کوڑوں کی صورت میں ہر زانی مرد و عورت کے لیے بیان کی جا چکی ہے۔[14]

اسی طرح کی ایک مثال یہ آیت بھی ہے:

وَ جَعَلۡنَا بَیۡنَھُمۡ مَّوۡبِقًا. وَرَاَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ النَّارَ فَظَنُّوۡۤا اَنَّھُمۡ مُّوَاقِعُوۡھَا. (الکہف ۱۸: ۵۲-۵۳)	''ہم اُن کے درمیان ایک ہلاکت کا گڑھا حائل کر دیں گے اور یہ مجرم اُس کی آگ کو دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اُسی میں گرنے والے ہیں۔''

یہاں بھی دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اکثر مترجمین 'النَّار' کے الف لام کو عہد ذہنی کا قرار دیتے ہوئے اس کا ترجمہ ''آگ''، ''دوزخ'' اور ''جہنم'' کے الفاظ میں کر رہے ہیں۔ ''البیان'' میں اسے عہد خارجی کا قرار دیتے ہوئے اس کا ترجمہ ''اُس کی آگ'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور اس سے مراد پچھلی آیت میں مذکور ہلاکت کے گڑھے کی آگ ہے کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں یہ جملہ پچھلی بات سے گویا کٹ کر رہ جاتا ہے۔

بعض اوقات ایک ہی لفظ قرآن کے متعدد مقامات پر الف لام کی مختلف حیثیتوں میں استعمال ہو رہا ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس کے سمجھنے میں کسی بڑی غلطی کے راہ پا جانے کا اِمکان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر 'الۡاِنۡسَان' اور 'الۡمُشۡرِکِیۡن' کے الفاظ۔ ہم ان میں سے صرف 'الۡمُشۡرِکِیۡن' کو ذیل میں بیان کرتے ہیں:

اِنَّ اِبۡرٰھِیۡمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیۡفًا وَلَمۡ یَکُ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ. (النحل ۱۶: ۱۲۰)	''حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم (اپنی جگہ) ایک الگ امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور یک سو اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔''

اس آیت میں سیدنا ابراہیم کے اوصاف حمیدہ بتائے جا رہے ہیں، کچھ ایجابی انداز میں اور کچھ سلبی انداز میں۔ چنانچہ بادنیٰ تامل سمجھ لیا جا سکتا ہے کہ یہاں 'الۡمُشۡرِکِیۡن' کا الف لام مشرکین کے زمرے، یعنی ان کی جنس کو بیان کرنے کے لیے آیا ہے۔

مَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَھۡلِ الۡکِتٰبِ	''اہل کتاب ہوں یا مشرکین، ان میں سے جن

---

[14] 'الۡعَذَاب' سے پہلے اصل میں دو سزاؤں کا بیان ہوا ہے: ایک زنا کی اور دوسرے قذف کی۔ 'الۡعَذَاب' سے مراد زنا کی سزا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں جس عورت سے سزا کے ٹل جانے کا بیان ہو رہا ہے، وہ اس سیاق میں کسی پر الزام نہیں لگا رہی کہ اس سزا کو قذف کی سزا قرار دیا جائے، بلکہ خود اُس پر الزام لگایا جا رہا ہے، اس لیے یہ قطعی طور پر زنا کی سزا ہی ہے۔

وَلَا الۡمُشۡرِکِیۡنَ اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ. (البقرہ۲: ۱۰۵)

لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ نہیں چاہتے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے کوئی خیر تم پر نازل کی جائے۔‘‘

اس آیت میں ’الۡمُشۡرِکِیۡن‘ کا الف لام جنس کے بجاے عہد ذہنی کا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ متکلم اور مخاطب، دونوں کے ہاں یہ لوگ بالکل متعین ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا آیت میں بیان کردہ یہ وصف بھی کہ وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ تم پر خدا کی طرف سے کوئی خیر اتاری جائے، اُنھیں واضح طور پر متعین کر رہا ہے۔

وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ اسۡتَجَارَکَ فَاَجِرۡہُ حَتّٰی یَسۡمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ. (التوبہ۹: ۶)

’’اور اگر (اس دار و گیر کے موقع پر) اِن مشرکوں میں سے کوئی شخص تم سے امان چاہے (کہ وہ تمھاری دعوت سننا چاہتا ہے) تو اُس کو امان دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔‘‘

یہاں الف لام عہد خارجی کے لیے ہے اور ’’البیان‘‘ کے ترجمہ میں اس کے لیے ’’اِن مشرکوں‘‘ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس تعیین کی دلیل یہ ہے کہ آیت ۱ میں بھی ’الۡمُشۡرِکِیۡن‘ کا یہی لفظ آیا ہے اور زیر بحث آیت میں معرفہ کے اس اِعادہ نے یہ بات طے کر دی ہے کہ اس دوسرے سے مراد بھی اصل میں پہلا ہی ہے۔ یعنی اس سے مراد بھی وہی لوگ ہیں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے من حیث الجملہ اِتمام حجت کیا جا چکا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔ صلہ کا استعمال

بعض حروف لفظ کے اوپر صلہ ہو کر آتے ہیں اور معنی میں اچھا خاصا تنوع پیدا کر دیتے ہیں اور بعض اوقات متعدد معانی پر متضمن بھی ہو جاتے ہیں، چنانچہ ترجمہ کرتے ہوئے ان کی مکمل طور پر رعایت کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ ’’البیان‘‘ میں یہ رعایت کس قدر برتی گئی ہے، اس کے لیے ہم اُن چند آیتوں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جن میں ایک ہی صلہ کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر ’اِلٰی‘ کا صلہ:

وَعَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡعٰکِفِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ. (البقرہ۲: ۱۲۵)

’’اور ابراہیم و اسمٰعیل کو اِس بات کا پابند کیا کہ میرے اِس گھر کو اُن لوگوں کے لیے پاک رکھو جو (اِس میں) طواف کرنے، اعتکاف کرنے اور رکوع و سجود کرنے کے لیے آئیں۔‘‘

’عَہِدَ‘ کے ساتھ جب ’اِلٰی‘ کا صلہ آئے تو اب اس کا مطلب صرف وعدہ کرنے کا نہیں، بلکہ اس سے آگے

بڑھ کر کسی پر ذمہ داری ڈال دینے کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کے لیے ''اس بات کا پابند کیا'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ. (الانعام ۶:۱۲)

''اُس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے۔ وہ تم سب کو جمع کر کے ضرور قیامت کی طرف لے جائے گا جس میں کوئی شبہ نہیں۔''

اس آیت میں 'اِلٰی' کا صلہ 'لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ' کے بعد آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی لفظ ہانکنے اور لے جانے کے معنی میں محذوف ہے۔ چنانچہ دیگر مترجمین کے برعکس، جنھوں نے عام طور پر اس کا ترجمہ ''جمع کرے گا'' کیا ہے، ''البیان'' میں اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''وہ تم سب کو جمع کر کے ضرور قیامت کی طرف لے جائے گا۔''

وَقَضَيۡنَاۤ اِلٰى بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ فِى الۡكِتٰبِ لَتُفۡسِدُنَّ فِى الۡاَرۡضِ مَرَّتَيۡنِ وَلَتَعۡلُنَّ عُلُوًّا كَبِيۡرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۴)

''بنی اسرائیل کو ہم نے اِسی کتاب میں اپنے اِس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہاں 'قَضَيۡنَا' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ آیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اسے کسی ایسے فعل پر متضمن مانا جائے جو اس صلہ سے مناسبت رکھنے والا ہو اور وہ 'أبلغنا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل ہو سکتا ہے۔ مترجمین نے بالعموم ان دونوں افعال میں سے ایک کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے، جیسا کہ ''فیصلہ کر دیا'' اور ''صاف کہہ سنایا''۔ ''البیان'' میں دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے: ''اس فیصلے سے آگاہ کر دیا''۔

وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ. اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ. (القیامہ ۷۵:۲۲-۲۳)

''کتنے چہرے اُس دن تر و تازہ ہوں گے، اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر۔''

اس آیت میں 'نظر' کے ساتھ 'اِلٰی' آیا ہے۔ اس کے دو ترجمے کیے جا سکتے ہیں: ایک کسی شے کی طرف دیکھنا اور دوسرے کسی سے اچھی بات کی کوئی امید رکھنا۔ سیاق دلیل ہے کہ یہ دوسرے معنی میں ہے، اس لیے کہ یہاں اگلی بات یہ بیان ہوئی ہے کہ دوزخ میں جانے والے اس اندیشہ میں مبتلا ہوں گے کہ اب وہ آفت ٹوٹنے والی ہے جو اُن کی کمر کو توڑ ڈالے گی۔ اب ظاہر ہے اس اندیشے کے مقابلے میں امید و رجا کا بیان ہی زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ ''البیان'' میں اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ''اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر'' کیا گیا ہے۔

'اِلٰی' کی طرح حرف 'عَلٰی' بھی صلہ ہو کر آتا ہے اور الفاظ میں معنی کی کئی جہتیں پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر یہ آیتیں:

وَاِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصۡطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ. (آل عمران ۳:۴۲)

''اور جب فرشتوں نے مریم سے کہا: اے مریم، اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا ہے اور پاکیزگی عطا فرمائی ہے اور دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دے کر (اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے) منتخب کر لیا ہے۔''

'اصۡطَفٰی' فعل کے ساتھ جب 'عَلٰی' کا صلہ آتا ہے تو یہ انتخاب سے آگے بڑھ کر اس میں ترجیح اور فضیلت کا مضمون بھی پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دے کر منتخب کر لیا ہے۔''

وَنَحۡشُرُھُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ عَلٰی وُجُوۡھِھِمۡ عُمۡیًا وَّ بُکۡمًا وَّ صُمًّا. (بنی اسرائیل ۱۷:۹۷)

''قیامت کے دن ہم اُن کو اُن کے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے اکٹھا کریں گے، اندھے، گونگے اور بہرے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں 'نَحۡشُرُھُمۡ' کے ساتھ 'عَلٰی' استعمال ہوا ہے، اس لیے اس کے اندر اکٹھا کرنے کے ساتھ ساتھ گھسیٹنے کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے۔ عام طور پر مترجمین اس کے ایک پہلو کو بیان کرتے ہیں: اکٹھا کرنے کو یا گھسیٹنے اور چلانے کو۔ ''البیان'' کے ترجمہ میں اس کے یہ دونوں پہلو بیان کر دیے گئے ہیں: ''منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے اکٹھا کریں گے۔''

قَالَ ھٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسۡتَقِیۡمٌ. (الحجر ۱۵:۴۱)

''فرمایا: یہ (بندگی کا راستہ) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والا ہے۔''

اس آیت میں 'صِرَاط' کے بعد 'عَلٰی' آیا ہے۔ اب بات صرف یہ نہیں ہے کہ یہ راستہ سیدھا ہے اور خدا تک پہنچ جانے والا ہے، بلکہ اس میں یہ اضافی مضمون بھی پیدا ہو گیا ہے کہ یہ اپنے راہ رووں کو خود منزل پر پہنچا دینے والا ہے۔ ''البیان'' میں اس کے لیے ''مجھ تک پہنچانے والا ہے'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ. (البقرہ ۲:۳۷)

''پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) چند الفاظ سیکھ لیے (اور اُن کے ذریعے سے توبہ کی) تو اُس پر اُس نے عنایت فرمائی اور اُس کو معاف کر دیا۔''

'تَابَ' کے بعد 'عَلٰی' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں 'أقبل' یا اِس سے ملتا جلتا کوئی اور مفہوم بھی موجود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو معاف کیا اور پوری توجہ سے اُس کی طرف ملتفت بھی ہو گیا۔ 'تَابَ' کے ساتھ یہی اضافی

مفہوم ہے جسے ''البیان'' میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''اُس نے عنایت فرمائی اور اُس کو معاف کر دیا۔''

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ. (التکویر ۸۱: ۲۴) ''وہ غیب کی باتوں پر کبھی حریص نہیں رہا۔''

عربی زبان میں 'ضَنِیْن' کے معنی بخیل کے ہیں۔ اس آیت میں اس کا صلہ 'ب' نہیں، بلکہ 'عَلٰی' آیا ہے، چنانچہ اب اس میں حریص ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کاہنوں کی طرح غیب دانی کے حریص نہیں ہیں، بلکہ وہ خدا کی منشا اور اُس کے حکم سے نبوت اور وحی سے سرفراز ہوئے ہیں۔

'عَنْ' صلہ ہو کر آئے تو اس سے بھی کئی معانی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کو سمجھنے میں مترجمین کی طرف سے بعض اوقات سہو یا تساہل واقع ہو جاتا ہے:

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ. (الانعام ۶: ۹۳) ''آج (تمھارے) اِس (جرم) کی پاداش میں تمھیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا کہ تم اللہ پر ناحق تہمت باندھتے تھے اور اُس کی آیتوں سے متکبرانہ اِعراض کرتے تھے۔''

اس آیت میں 'تَسْتَكْبِرُوْنَ' کے ساتھ 'عَنْ' کا صلہ آیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لفظ یہاں اِعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔ عام طور پر مترجمین نے اس کا ترجمہ ''اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے'' کیا ہے، اس کے برخلاف، ''البیان'' میں اِعراض کے اس مفہوم کو شامل کرتے ہوئے ترجمے میں ''متکبرانہ اعراض'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ. (الاعراف ۷: ۷۷) ''پھر انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی۔''

مترجمین نے بالعموم یہاں صرف ''سرکشی'' کا ترجمہ کیا ہے، دراں حالیکہ 'عَتَوْا' کے ساتھ 'عَنْ' نے آ کر یہاں سرکشی کے ساتھ ساتھ منکرین کی نافرمانی کو بھی بیان کیا ہے۔ ''البیان'' میں ان دونوں مفاہیم کو اس طرح ادا کیا گیا ہے: ''پورے تمرد کے ساتھ اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی۔''

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ. (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۳) ''(اے پیغمبر)، قریب تھا کہ یہ اُس چیز سے ہٹا کر تم کو فتنے میں ڈال دیں جو ہم نے تمھاری طرف وحی کی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس آیت میں 'یَفۡتِنُوۡنَکَ' اپنے ساتھ 'عَنۡ' کے صلہ کی وجہ سے 'یصرفونك' پر مشتمل ہو گیا ہے، چنانچہ اس کا مطلب اب صرف فتنہ میں ڈال دینا نہیں ہے، بلکہ نازل ہونے والی وحی سے ہٹا کر فتنہ میں ڈال دینا ہے۔ 'عَنۡ' کے اسی متضمن معنی کا لحاظ ہے کہ ''البیان'' میں ''اُس چیز سے ہٹا کر فتنے میں ڈال دیں'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

حرف 'لام' بھی بہت سے الفاظ کے ساتھ بطور صلہ استعمال ہوتا ہے اور اپنے اندر معنی کے بہت سے پہلو رکھتا ہے:

قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَکُمۡ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ ھَدٰکُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ. (الحجرات ۴۹: ۱۷)

''کہہ دو کہ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تم کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔''

مترجمین 'ھَدٰکُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ' کا ترجمہ بالعموم ''ایمان کی ہدایت کی'' کرتے ہیں، دراں حالیکہ 'ھدایت' کے بعد 'لام' کا صلہ ہو تو اس میں توفیق کا مضمون آ جاتا ہے۔ ''البیان'' میں اسی رعایت سے ''ایمان کی توفیق عطا فرمائی'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

وَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعۡیُنِنَا. (الطّور ۵۲: ۴۸)

''اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کرو۔ (یہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے)، اس لیے کہ تم ہماری نگاہ میں ہو۔''

اس آیت میں 'صبر' کے ساتھ 'لام' کا صلہ آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انتظار کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس کا صحیح ترجمہ وہی ہو سکتا ہے جس میں صبر کے ساتھ ساتھ انتظار کے پہلو کو بھی بیان کیا جائے اور ''البیان'' میں ایسا ہی کیا گیا ہے: ''ثابت قدمی کے ساتھ اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کرو۔''

بعض اوقات ایک ہی لفظ ہوتا ہے اور اس کا معنی و مفہوم صلہ کے بدل جانے سے بالکل بدل جاتا ہے۔ اس طرح کے الفاظ میں سے 'اِیۡمَان' کا لفظ ایک اچھی مثال ہے اور ذیل کی دو آیات میں اس کے دو مختلف مفاہیم آئے ہیں:

کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ. (البقرہ ۲: ۲۸۵)

''یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔''

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھۡرَۃً. (البقرہ ۲: ۵۵)

''اور یاد کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ، ہم تمھاری بات کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں۔''

'اٰمَنَ' کے ساتھ ''ب'' صلہ ہو کر آئے، جیسا کہ پہلی آیت میں آیا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے: کسی چیز پر ایمان

لانا۔ اگر ’لام‘ صلہ ہو، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے: کسی کی بات مان لینا۔ بعض اوقات مترجمین ’لام‘ صلہ کے ساتھ آنے والے ’اِیۡمَان‘ کا ترجمہ بھی ایمان لانا ہی کر دیتے ہیں۔ ’’البیان‘‘ میں کیے گئے ان آیتوں کے ترجمے میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس فرق کو ملحوظ رکھنے کی ایک اچھی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ اِعراب کا اثر

عربی زبان میں الفاظ پر مختلف اعراب آتے ہیں۔ ان کا دِقّت نظر سے مطالعہ معنی کی تعیین کرنے اور کلام کے بہت سے مضمرات کو سمجھنے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم ’’البیان‘‘ میں سے چند آیات کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

اِذۡ اَوۡحَیۡنَآ اِلٰٓی اُمِّکَ مَا یُوۡحٰٓی. اَنِ اقۡذِفِیۡہِ فِی التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِیۡہِ فِی الۡیَمِّ فَلۡیُلۡقِہِ الۡیَمُّ بِالسَّاحِلِ. (طٰہٰ ۲۰: ۳۸-۳۹)

’’جب ہم نے تمھاری ماں کو وہ بات الہام کی تھی جو (اس وقت تمھیں) وحی کی جا رہی ہے کہ اس بچے کو صندوق میں رکھو، پھر صندوق کو دریا میں ڈال دو۔ پھر دریا اُس کو کنارے پر ڈال دے۔‘‘

یہاں ’فَلۡیُلۡقِہِ‘ کا اِعراب قابل توجہ ہے۔ کئی مترجمین نے اس لفظ کو جوابِ امر خیال کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے، حالاں کہ اس پر لام آیا ہے اور اس وجہ سے یہ یقینی طور پر امر غائب ہے۔ ’’البیان‘‘ میں اس کے امر غائب ہونے کا لحاظ ہے کہ اس کا ترجمہ ’’پس دریا اُسے کنارے لا ڈالے گا‘‘ کے بجائے اس طرح کیا گیا ہے: پھر دریا اُس کو کنارے پر ڈال دے۔‘‘

وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡہِنُ فَیُدۡہِنُوۡنَ. (القلم ۶۸: ۹)

’’یہ تو چاہتے ہیں کہ تم ذرا نرم پڑو، پھر یہ بھی نرم پڑ جائیں گے۔‘‘

بعض مترجمین نے اس آیت کے مفہوم کو اس طرح کے الفاظ میں ادا کیا ہے: ’’وہ تو چاہتے ہیں کہ تو ذرا ڈھیلا ہو تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔‘‘ حالاں کہ اس آیت میں ’فَیُدۡہِنُوۡنَ‘ کا لفظ ’لَوۡ تُدۡہِنُ‘ کا جواب نہیں ہے کہ اس صورت میں یہاں ’فیدھنوا‘ لایا جاتا۔ یہ اصل میں ’لَوۡ تُدۡہِنُ‘ پر عطف ہے اور اس کا مبتدا ’ھم‘ یہاں محذوف کر دیا گیا ہے۔ ’فَیُدۡہِنُوۡنَ‘ کے اسی اعراب کا لحاظ ہے کہ ’’البیان‘‘ میں ’’نرم پڑ جائیں‘‘ کے بجائے ’’نرم پڑ جائیں گے‘‘ کے الفاظ میں ترجمہ ہوا ہے۔

وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِہِمۡ اِذَا عٰہَدُوۡا وَالصّٰبِرِیۡنَ

’’اور وفاداری تو اُن کی وفاداری ہے کہ جب عہد کر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ. (البقرہ۲: ۱۷۷)

بیٹھیں تو اپنے اِس عہد کو پورا کرنے والے ہوں اور خاص کر اُن کی جو تنگی اور بیماری میں اور جنگ کے موقع پر ثابت قدم رہنے والے ہوں۔‘‘

یہاں ’الصّٰبِرِیْنَ‘ کی صفت ’الْمُوْفُوْنَ‘ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت رفعی میں ہونی چاہیے تھی، مگر اسے حالت نصب میں لایا گیا ہے۔ اعراب کی یہ تبدیلی اصل میں علی سبیل الاختصاص، یعنی صفت پر خصوصی توجہ مبذول کروانے کے لیے ہوئی ہے۔ گویا متکلم کہنا چاہتا ہے کہ ’أنا أخص بالذکر الصابرین‘، یعنی میں صابرین کا ذکر یہاں خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اس اعراب سے پیدا ہونے والا یہ معنی ہے کہ ’’البیان‘‘ میں ترجمہ کرتے ہوئے اس کے لیے ’’خاص کر‘‘ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

وَیَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مَالَھُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ. (الشوریٰ۴۲: ۳۵)

’’اِس لیے تباہ کردے کہ اُن سے انتقام لے اور اس لیے کہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کٹ حجتی کر رہے ہیں، وہ جان لیں کہ اُن کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔‘‘

اس آیت میں ’یَعْلَمَ‘ حالت نصب میں ہے، مگر کئی مترجمین نے اسے بالکل نظر انداز کر کے ترجمہ کیا ہے۔ سیاق میں دیکھا جائے تو یہ نصب لام تعلیل کی وجہ سے ہے، جو ’یَعْلَمَ‘ کے معطوف علیہ سمیت حذف ہو گیا ہے۔ ’’البیان‘‘ میں اسے ادا کرنے کے لیے پہلے ایک مناسب حال معطوف علیہ، یعنی: ’’اس لیے تباہ کردے کہ اُن سے انتقام لے۔‘‘ نکالا گیا ہے اور اس کے بعد ’و لیعلم‘ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

دیگر الفاظ

مرادی معنی معلوم کرنے میں لفظ کی ساخت اور اُس پر آنے والے عوارض کے بعد تیسری اہم تر چیز یہ ہے کہ کلام میں آئے ہوئے دیگر الفاظ پر بھی اچھی طرح سے غور و خوض کر لیا جائے۔ دوسری صورت میں اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ ایک مجوزہ معنی کی تائید میں ہم چاہے لغت کے شواہد اور قرآن میں سے اُس کے بہت سے نظائر پیش کر دیں، مگر وہ حقیقت میں کسی مقام پر حشو قرار پاتا ہو یا بالکل ہی غلط بیٹھتا ہو۔ اس بات کو ہم چند عنوانات کے تحت واضح کرتے ہیں:

ا۔ ساتھ میں آجانے والے لفظ کا معنی پر اثر

بسا اوقات کسی لفظ کے معنی کی تعیین اُن دوسرے الفاظ پر منحصر ہوتی ہے جو کلام میں اس کے ساتھ ہی استعمال ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس کی مثال کے لیے ذیل کی چند آیتیں دیکھ لی جا سکتی ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكۡتُبُوۡهُ. (البقرہ ۲:۲۸۲)

''ایمان والو، تم کسی مقرر مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اُسے لکھ لو۔''

یہاں 'تَدَايَنۡتُمۡ' کا لفظ آیا ہے، جس کا مطلب ہے ادھار لین دین کرنا۔ اس کے بعد چونکہ 'بِدَيۡنٍ' بھی آ گیا ہے جس نے ادھار معاملے کی وضاحت کر دی ہے، اس لیے 'تَدَايَنۡتُمۡ' اب مجرد ہو کر صرف لین دین تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ''البیان'' میں اسی لیے 'بِدَيۡنٍ' کے لیے ''ادھار'' اور 'تَدَايَنۡتُمۡ' کے لیے محض ''لین دین کرو'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

هُوَ اللّٰهُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى. (الحشر ۵۹:۲۴)

''وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا اور صورت دینے والا۔ سب اچھے نام اُسی کے ہیں۔''

عربی زبان میں بعض الفاظ اپنے اصل معنی سے ہٹ کر توسعاً دوسرے معنوں میں استعمال ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال لفظ 'خلق' بھی ہے جو اپنے وسیع تر اطلاق میں تخلیق کرنے اور بنانے کے معنی میں آتا ہے، وگرنہ اس کا اصل معنی اندازہ کرنا اور خاکہ بنانا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں یہ اپنے اصل معنی میں آیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے ساتھ آنے والا لفظ 'الۡبَارِئُ' ہے، جس کا اپنا ایک معنی بھی چونکہ کسی شے کو وجود میں لانا ہے، اس لیے اب 'الۡخَالِق' اپنے اصل معنی کی طرف لوٹ گیا ہے۔ ''البیان'' میں یہی وجہ ہے کہ اس کا ترجمہ ''نقشہ بنانے والا'' کیا گیا ہے۔ اس ترجمہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس ترتیب میں، یعنی نقشہ بنانے اور کسی شے کو وجود میں لانے کے بعد 'الۡمُصَوِّر' کے استعمال میں، 'الۡمُصَوِّر' کا صحیح مفہوم بھی ہمارے سامنے آ گیا ہے کہ وہ کسی شے کی تصویر بنانا نہیں، بلکہ اُسے صورت دینا، یعنی نوک پلک درست کر کے اُسے آخری شکل دے دینا ہے۔

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ. (آل عمران ۳:۸۵)

''اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو اُس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔''

لفظ 'دین' کے ایک سے زائد مستقل مفاہیم ہیں۔ اس آیت میں اس کے ساتھ آنے والا 'الۡاِسۡلَام' چونکہ ایک مذہب کے نام کے طور پر آیا ہے، اس لیے یہ طے ہے کہ اس کے غیر کے لیے آنے والا 'دِيۡنًا' کا لفظ بھی اپنے بہت سے مفاہیم میں سے ایک مفہوم، یعنی ''مذہب'' ہی کے لیے آیا ہے۔

مَا كَانَ لِيَاۡخُذَ اَخَاهُ فِىۡ دِيۡنِ الۡمَلِكِ اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ. (یوسف ۱۲:۷۶)

''بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ اپنے بھائی کو روکنے کا مجاز نہ تھا، الاّ یہ کہ خدا ہی چاہے۔''

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

اس آیت میں 'دین' کے لفظ کے ساتھ 'الْمَلِكِ' کی اضافت کا خیال رکھا جائے تو یہاں اس کا مطلب ''قانون'' ہی موزوں قرار پاتا ہے، جیسا کہ ''البیان'' میں اس کا یہ ترجمہ کیا بھی گیا ہے۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا. فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا. فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا. فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا. اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ. وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ. وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ. (الذاریات ۵۱: ۱-۷)

''تند ہوائیں گواہی دیتی ہیں جو غبار اڑاتی ہیں، پھر (پانی سے لدے ہوئے بادلوں کا) بوجھ اٹھاتی ہیں، پھر نرمی کے ساتھ چلتی ہیں، پھر الگ الگ معاملہ کرتی ہیں۔ (یہ گواہی دیتی ہیں) اور دھاریوں والا آسمان بھی کہ جس عذاب کی وعید تمھیں سنائی جا رہی ہے، وہ یقیناً سچ ہے اور جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی۔''

اس آیت میں قسم اور جواب قسم کی باہمی موافقت ہی طے کر دیتی ہے کہ 'الدِّيْن' کا لفظ جزا کے لیے آیا ہے، مگر 'وَاقِع' کا لفظ بھی بڑی حد تک اس تعیین میں معاونت کر رہا ہے کہ اس کا استعمال لفظ 'دین' کے دیگر مفاہیم، یعنی مذہب اور قانون سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا اور یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ ''جزا و سزا'' کیا گیا ہے۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ. اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ. (الزمر ۳۹: ۲-۳)

''سو اللہ ہی کی بندگی کرو، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ سنو، خالص اطاعت اللہ ہی کے لیے ہے۔''

فرمایا ہے کہ اللہ ہی کی بندگی کرو۔ اس کے بعد 'الدِّيْن' کے لفظ کو لانا یہ بالکل واضح کر دیتا ہے کہ یہاں اس سے اُسی بندگی کی عملی صورت، یعنی اطاعت مراد لی گئی ہے۔ چنانچہ ''البیان'' میں اس طرح کے مواقع پر اس کا ترجمہ ''اطاعت'' ہی کیا جاتا ہے۔

بعض اوقات دو الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح آتے ہیں کہ دونوں ہی اپنے اپنے معنی کو واضح کر دیتے ہیں:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (البقرہ ۲: ۱۲۹)

''پروردگار، اور اُنھی میں سے تو اُن کے اندر ایک رسول اٹھا جو تیری آیتیں انھیں سنائے اور قانون اور حکمت سکھائے اور اس طرح انھیں پاکیزہ بنائے۔''

'الْكِتٰب' قرآن میں ایک سے زائد معانی کے لیے آتا ہے: خط، کتاب اور قانون کے لیے۔ اسی طرح 'الْحِكْمَة'

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بھی سمجھ بوجھ، دلائل و براہین اور دین کی حقیقت اور ایمان و اخلاق کے مباحث کے لیے آتا ہے۔لیکن ان دونوں الفاظ کے بارے میں یہ طے ہے کہ جب یہ ایک دوسرے پر عطف ہو کر آئیں گے تو اب 'الْكِتٰب' سے مراد قانون اور 'الْحِكْمَة' سے مراد دین کی حقیقت اور ایمان و اخلاق کے مباحث ہی ہوں گے۔اس طرح کے تمام مواقع پر ''البیان'' کے تفسیری حواشی میں ان معانی کی بخوبی وضاحت کر دی گئی ہے۔

۲۔تقابل میں آنے والے لفظ کا معنی پر اثر

قرآن میں بہت سے مقامات پر کسی لفظ کے معنی کی تعیین اس کے مقابل میں آنے والے الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔اس کی مثال کے لیے ذیل کی چند آیتیں دیکھ لی جا سکتی ہیں:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ. (النحل۱۶:۳۶)

''ہم نے ہر قوم میں ایک رسول اِس دعوت کے ساتھ بھیجا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو اور شیطان سے بچو۔''

'طاغوت' ایک وصف ہے جو متکبر، سرکش اور اپنی حدود سے تجاوز کرنے والے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ زیر نظر آیت میں اس کا اطلاق شیطان پر کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہاں پیغمبروں کی دعوت کے دو بنیادی اجزا کا بیان ہو رہا ہے: اللہ کی عبادت اور طاغوت سے اجتناب۔سو اس تقابل، یعنی اجتناب کے مقابلے میں عبادت اور 'الطَّاغُوْت' کے مقابلے میں لفظ 'اللّٰه' کا لحاظ رہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں اس سے مراد لامحالہ شیطان ہی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ. (البقرہ۲:۱۵۲)

''لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرے شکر گزار بن کر رہو، میری ناشکری نہ کرو۔''

'کفر' کا لفظ انکار اور ناشکری، دونوں مفاہیم کے لیے آتا ہے۔اس کے مقابل میں ایمان کا ذکر ہو تو اس کا مطلب ماننے سے انکار کر دینا، یعنی کفر کرنا ہوتا ہے اور مقابل میں شکر گزاری ہو تو طے ہو جاتا ہے کہ اب اس کا مطلب ناشکری کرنا ہے۔سو یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس لفظ کا ترجمہ یہاں ''ناشکری'' کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ. (النحل۱۶:۹۰)

''اللہ (اِس میں) عدل اور احسان اور قرابت مندوں کو دیتے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور بے حیائی، برائی اور سرکشی سے روکتا ہے۔''

'مُنْكَر' سے مراد اصل میں وہ برائیاں ہوتی ہیں جنھیں انسان بالعموم برا جانتے ہیں۔ یہاں اُن میں سے خاص وہ برائیاں مراد ہیں جو کسی کا حق تلف کرنے والی ہوتی ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ 'عَدْل' کے مقابل میں آیا ہے،

جس کا مطلب حق دار کو اس کا حق ادا کرنا ہے۔ ''البیان'' کے حواشی میں اس لفظ کی مراد کے متعلق یہ وضاحت اچھی طرح سے کر دی گئی ہے۔

۳۔ساتھ میں آنے والی ضمائر کا معنی پر اثر

ضمیریں بھی اپنی حقیقت میں لفظ ہوتی ہیں جو اپنے مراجع کی طرف رجوع کرتی ہیں اور اس اعتبار سے یہ اُن کے ساتھ آئے ہوئے دوسرے الفاظ ہی ہوتی ہیں۔ سو معنی کی تعیین میں اُن کا اور اُن کے مراجع کا صحیح طور پر ادراک ہونا بہت زیادہ ضروری ہوتا ہے:

فَبَدَاَ بِاَوۡعِیَتِهِمۡ قَبۡلَ وِعَآءِ اَخِیۡهِ ثُمَّ اسۡتَخۡرَجَهَا مِنۡ وِّعَآءِ اَخِیۡهِ. (یوسف ۱۲: ۷۶)

''اِس پر اُس شخص نے یوسف کے بھائی کی خرجی سے پہلے اُن کی خرجیوں کی تلاشی لینا شروع کی، پھر (بادشاہ کا پیمانہ تو نہیں ملا، لیکن) اُس کے بھائی کی خرجی سے اُس نے وہ پیالہ برآمد کر لیا (جو یوسف نے رکھا تھا)۔''

سیدنا یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں 'اِسۡتَخۡرَجَهَا' کا لفظ آیا ہے۔ عام طور پر اس کی ضمیر 'ها' کا مرجع لوگوں نے بادشاہ کے پیمانے کو قرار دیا ہے، دراں حالیکہ یہ ضمیر مونث ہے اور بادشاہ کے پیمانے کے لیے لفظ 'صُوَاع' استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ یہ طے ہے کہ بنیامین کے سامان سے نکلنے والا پیالہ بادشاہ کے 'صُوَاع' کے بجاے یوسف کا 'السِّقَایَة' تھا۔ ''البیان'' میں ضمیر کے اس صحیح مرجع کے لحاظ سے ترجمہ کیا گیا ہے اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں واقعے کی اصل صورت بھی سامنے آجاتی ہے اور وہ طول طویل بحثیں بھی خود سے ختم ہو جاتی ہیں جو لوگوں نے حضرت یوسف کے اخلاق حسنہ پر، افسوس یہ کہ اُٹھا دی ہیں۔

وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَکَبِیۡرَةٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ. (البقرہ ۲: ۴۵)

''اور (اس راہ پر چلنے کے لیے) صبر اور نماز سے مدد چاہو، اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب بہت بھاری ہے، مگر ان کے لیے بھاری نہیں ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔''

اس آیت میں 'وَاِنَّهَا' کی ضمیر کے بارے میں بحث ہے کہ یہ کس طرف راجع ہے؟ مترجمین اس کے مونث ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے اسے بالعموم 'الصَّلٰوة'، یعنی نماز کی طرف لوٹاتے ہیں، دراں حالیکہ یہاں اصل مسئلہ ضمیر اور اس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے مرجع میں تذکیر و تانیث کی موافقت کا ہے ہی نہیں۔ عربی زبان میں اس طرح کے مواقع پر جب مونث ضمیر لائی جاتی ہے تو وہ کسی ایک چیز کے بجاے کلام میں مذکور سب چیزوں کی طرف لوٹ رہی ہوتی ہے۔ یہاں بھی مرجع صرف نماز نہیں، بلکہ وہ سب باتیں ہیں جو اس سلسلۂ بیان میں بنی اسرائیل سے کہی گئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''یہ سب بہت بھاری ہے۔''

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ. (المائدہ ۵:۱۰۲)

''تم سے پہلے ایک قوم نے اسی طرح کی باتیں پوچھیں، پھر اُنھی کے منکر ہو کر رہ گئے تھے۔''

فرمایا ہے کہ ایمان والو، تم ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تم پر گراں ہوں۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ'۔ یہاں 'ھا' کی ضمیر کا مرجع تو طے ہے کہ وہ 'اَشْيَآءَ' کا لفظ ہی ہے، مگر یاد رہے کہ اس سے مراد خاص وہ 'أشياء' نہیں، بلکہ اُن کی نوعیت ہے۔ یعنی، مطلب یہ نہیں ہے کہ تم سے پہلے لوگوں نے بھی ٹھیک یہی 'أشياء'، یعنی باتیں پوچھی تھیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسی قسم کی باتیں تھیں جو اُنھوں نے بھی پوچھی تھیں۔ ''البیان'' میں بیان نوعیت کی اس ضمیر کا لحاظ ہے کہ ترجمے میں ''اسی طرح کی باتیں'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا. (البقرہ ۲:۷۳)

''چنانچہ ہم نے کہا: اِس (مردے) کو اُسی (گاے) کا ایک ٹکڑا مارو (جو قسمیں کھانے کے لیے ذبح کی گئی ہے تو وہ زندہ ہو گیا)۔''

اس مقام پر بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو واقعات بیان ہوئے ہیں: ایک میں اُنھیں قسامہ کی غرض سے گاے قربان کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس پر انھوں نے کافی لیت و لعل کرنے کے بعد عمل کیا۔ دوسرے واقعہ میں بھی قتل کے ایک مقدمے اور قسامہ کا بیان ہے جس میں انھوں نے جھوٹی قسمیں کھائیں اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا'۔ یہاں 'ھا' کی ضمیر کا مرجع بظاہر ایسا لگتا ہے کہ پہلے واقعہ میں ذبح ہونے والی گاے ہی ہے، مگر تدبر کی نگاہ سے دیکھیں تو یہ اصل میں وہ گاے ہے جو دوسرے واقعہ میں ذبح کی گئی ہے، لیکن اس ساری بات کو لفظوں میں بیان کرنے کے بجاے اس کے لیے محض ایک ضمیر لائی گئی ہے۔ ''البیان'' میں یہی وجہ ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے اس ضمیر میں مضمر ساری بات کو قوسین کے اندر کھول دیا گیا ہے۔

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ. فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ

''یاد کرو، جب خاصے کے اصیل اور عمدہ گھوڑے شام کے وقت اُس کے ملاحظے کے لیے پیش کیے گئے

رَبِّیْ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ. (ص۳۸: ۳۱-۳۲)

(اور اُن کے دیکھنے میں وہ ایسا محو ہوا کہ نماز جاتی رہی) تو اُس نے کہا: یہ تو اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہو کر، میں مال کی محبت میں لگ گیا، یہاں تک کہ آفتاب (مغرب کے) پردے میں چھپ گیا ہے۔‘‘

اوپر جتنی مثالیں گزریں ان میں ضمیر کے مراجع کسی نہ کسی صورت میں کلام کے اندر موجود ہیں۔ بعض اوقات یہ مذکور نہیں ہوتے، مگر وہاں موجود ضرور ہوتے اور صرف قرینہ سے سمجھ لیے جاتے ہیں۔ سیدنا سلیمان کے اس واقعہ میں بھی دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ 'تَوَارَتْ' کی ضمیر کا فاعل لفظوں میں بیان نہیں ہوا، بلکہ اسے کلام میں بیان کردہ ’’شام کے وقت‘‘ سے سمجھا گیا ہے کہ وہ اصل میں آفتاب ہے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نقد و نظر

ساجد حمید

نوح اور ابراہیم: نقدِ احباب کا جائزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''ابراہیم ذریت نوح نہیں، قرآن کا ایک انکشاف'' کے موضوع پر میرا ایک مضمون ستمبر ۲۰۱۸ء کے ''اشراق'' میں طبع ہوا تھا، جس پر اہل علم احباب کی طرف سے سوالات وتبصرے زبانی وتحریری (مطبوعہ ''اشراق'' شمارہ نومبر ۲۰۱۸ء) صورت میں موصول ہوئے۔ جس سے مجھ پر واضح ہوا کہ میرے استدلال کے بعض پہلو تشنۂ توضیح ہیں، اور بعض آیات کا محل بھی توضیح طلب ہے۔ اس مقصد سے یہ توضیحی مضمون پیش خدمت ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں اپنے مدعا کو نئی ترتیب سے پیش کیا ہے اور دوسرے حصہ میں نقدِ احباب کا جائزہ لیا ہے۔

توضیح استدلال

پہلے میں اپنے استدلال کو نئی ترتیب سے بیان کروں گا، اس لیے کہ میرے طبع شدہ مضمون کی بُنت میں درج ذیل ترتیب ممکن نہیں تھی۔ میرا استدلال ان نکات پر مشتمل تھا:

۱۔ قرآن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح اور ان کی اولاد کے علاوہ لوگ بھی کشتی میں سوار تھے۔ یہ اتنا واضح ہے کہ اس کا انکار ممکن نہیں۔ اتنی بات مجھ پر نقد کرنے والوں نے بھی تسلیم کی ہے (''اشراق''، صفحہ ۴۸ اور ۵۴)۔ یہ بات اس آیت سے معلوم ہوتی ہے:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ کُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ[1] اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ. (ہود ۱۱: ۴۰)

''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور طوفان ابل پڑا تو ہم نے کہا: ہر قسم کے جانوروں میں سے نر و مادہ، ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اور اپنے گھر والوں کو بھی (اِس کشتی میں سوار کرا لو)، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی (سوار کرا لو) جو ایمان لائے ہیں۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔'' (ترجمہ از البیان)

'وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ' اور 'وَمَنْ اٰمَنَ' میں 'وَمَنْ اٰمَنَ' کا عطف 'اَهْلَكَ' سے مغایرت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے انھیں 'اَهْلَكَ' سے الگ مراد لینا ہوگا، یعنی اہل خانہ کے علاوہ بھی لوگ کشتی پر سوار تھے۔

اس آیت میں حضرت نوح کے اہل خانہ کے علاوہ جن اہل ایمان کا ذکر ہوا ہے، بعض آیات سے ان کا تعارف بہ زبان کفار بھی ہوتا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے اہل بیت کے علاوہ بھی لوگ ایمان لائے تھے اور حضرت نوح ان کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ انھی لوگوں کو مذکورہ بالا آیات کے مطابق کشتی نوح میں سوار کیا گیا تھا:

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ. قَالَ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ. اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰی رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ. وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ. (الشعراء ۲۶: ۱۱۱-۱۱۴)

''اُنھوں نے جواب دیا: کیا ہم تمھیں مان لیں، دراں حالیکہ تمھاری پیروی تو رذیلوں نے اختیار کر رکھی ہے۔ نوح نے کہا: مجھے کیا معلوم جو وہ کرتے رہے ہیں؟ ان کا حساب تو میرے رب کے ذمے ہے، اگر تم سمجھنا چاہو۔ (وہ مجھ پر ایمان لائے ہیں) اور (تمھاری خوشنودی کے لیے) میں اِن اہل ایمان کو دھتکارنے والا نہیں ہوں۔'' (ترجمہ از البیان)

رسولوں کی قوموں پر جب ہلاکت کا عذاب آتا ہے تو معلوم و معروف بات ہے کہ تمام اہل ایمان کو بچایا جاتا ہے۔ لہٰذا، لازم ہے کہ ان اہل ایمان کو بھی کشتی نوح میں جگہ ملی ہوگی۔

۲۔ جب قرآن سے ثابت ہے کہ کشتی میں اولادِ نوح کے علاوہ بھی لوگ تھے، تو جب کہا جائے کہ ''یہ نوح کے ہم سوار کی اولاد ہے'' تو اس سے مذکورہ شخص کے اولاد نوح میں سے ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ ہاں، اگر صرف نوح اور

---

[1] اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کے اہل خانہ کو اہل خانہ ہونے کی بنا پر کشتی کے سواروں میں شامل کیا گیا۔

ان کی اولاد ہی کشتی میں ہو تو پھر اس کی نفی نہیں ہوتی، لیکن اس صورت میں پھر یہ جملہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یوں کیوں کہا گیا: 'یہ نوح کے ہم سوار کی اولاد ہے'۔ تب یہ اسلوب غیر ضروری ہو گا، کیونکہ جب نوح کے خانوادہ کے علاوہ کوئی ہے ہی نہیں تو پھر اس گھماؤ پھراؤ کے طریقے پر بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ آیت یوں ہے:

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا. ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۲-۳)

''ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اُس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا، اِس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بناؤ۔ اے اُس شخص کے بیٹو، جسے ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا۔ جو (ہمارا) شکرگزار بندہ تھا۔''

یہاں سوال یہ ہے کہ اگر بنی اسرائیل اولادِ نوح میں سے تھے تو قرآن مجید نے 'ذریۃَ نوحٍ' کہنے کے بجائے 'ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ[۲]' کا گھما پھرا کر بات کرنے کا اسلوب کیوں اختیار کیا ہے؟ میرا کہنا یہ ہے کہ اس جملے کی یہ ساخت واضح کرتی ہے کہ یہ بتانا پیش نظر ہے کہ بنی اسرائیل اولادِ نوح میں سے نہیں ہیں۔ میرے استدلال کو ایک سادہ مثال سے سمجھتے ہیں:

''ہم نے نجوم کو شام میں بسایا، اس کے تین بیٹے، بہوئیں اور کچھ اہل ایمان بھی اس کے ساتھ بسائے۔ پھر ایک ہزار سال کے بعد افرایم پیدا ہوا، یہ نجوم کے ساتھ بسائے گئے شخص کی نسل سے ہے۔''

اس مثال میں زبان کی صریح دلالت یہی کہتی ہے کہ افرایم، نجوم کی نسل سے نہیں ہے۔ اگرچہ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک امکان ہے کہ وہ نجوم کے کسی بیٹے کی اولاد ہو، کیونکہ نجوم کے ساتھ بسائے جانے کی صفت پر وہ بھی پورا اترتا ہے۔ بلاشبہ، منطقی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے، لیکن لسانی طور پر یہ درست نہیں ہے، کیونکہ اگر افرایم، نجوم کی نسل سے ہے تو پھر وہ وجہ متعین ہونی چاہیے جس کی وجہ سے یہ پیچ دار اسلوب: ''یہ نجوم کے ساتھ بسائے گئے شخص کی نسل سے ہے'' اختیار کیا گیا۔ قرآن کی ابانت یہ تقاضا کرتی ہے کہ یا سیدھا سیدھا یہ کہا جائے کہ 'ذریۃ نوحٍ' یا یہ کہا جائے کہ 'ذریۃ ابنِ نوحٍ'۔ لہٰذا جو بنی اسرائیل کو آل نوح مانتے ہیں، انھیں اس اسلوب کے اختیار کرنے کی وجہ بتانی ہو گی کہ سیدھا جملہ کہنے کے بجائے 'ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ' کا پیچ دار اسلوب کیوں اختیار کیا گیا؟ جب کہ قرآن مجید کا خود اپنا

۲۔ سورۂ بنی اسرائیل کی مذکورہ بالا آیت 'ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ' میں آیا ہوا 'مَنْ' جمع کے معنی میں نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ذریت سے اضافت اس میں مانع ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بیان ہے کہ اس میں کوئی اینچ پینچ یا کجی نہیں ہے،'' بلکہ جو کچھ فرمایا ہے، فصیح و بلیغ زبان میں اور نہایت سادہ اور دل پذیر اسلوب میں فرمایا ہے'' (البیان: تفسیر سورۂ زمر ۳۹: ۲۸) اگر یہ جملہ اولاد نوح ہی کے بیان کا ہے تو —— نعوذ باللہ —— مجھے قرآن کا یہ جملہ پہیلیوں کے اسلوب کی یاد دلاتا ہے۔[۳]

۳۔ ابراہیم علیہ السلام سے متعلق قرآن مجید کے تمام مقامات میں کہیں بھی ان کی نوح علیہ السلام سے نسلی نسبت —— بہ الفاظ تو دور کی بات —— کنایۃً بھی بیان نہیں ہوئی۔ بلکہ جن مقامات پر اس کے بیان کا امکان تھا، وہاں بھی کلام میں، الفاظ و ضمائر سے واضح کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا نوح علیہ السلام سے نسلی تعلق نہیں ہے۔ وہ الفاظ و ضمائر کے مقامات ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:

ا: ابراہیم علیہ السلام کو 'من ذریة نوح' کے بجائے 'مِنْ شِيْعَتِهٖ' کہنا:

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ. اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ. اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ. ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ. وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ. (الصافات ۳۷: ۷۹-۸۳)

''نوح پر سلامتی ہے تمام دنیا والوں میں۔ ہم خوبی سے عمل کرنے والوں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ پھر ہم نے اوروں کو غرق کر دیا۔ یقیناً اُسی کے گروہ میں سے ابراہیم بھی تھا۔'' (ترجمہ از البیان)

حالاں کہ 'ذریت' کا لفظ بولنے میں نہ آہنگ و ذوق کے لیے گرانی تھی اور نہ فصاحت و بلاغت میں۔ پھر اسی سلسلۂ آیات میں آگے اسحٰق و ابراہیم علیہما السلام کی اولاد کا ذکر لفظ 'ذریت' ہی سے ہوا ہے: 'وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ' (الصافات ۳۷: ۱۱۳)۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ابراہیم حضرت نوح کی ذریت میں سے نہیں تھے، اسی لیے 'مِنْ شِيْعَتِهٖ' کے الفاظ چنے گئے ہیں۔

ب: ذیل کی آیات میں اسم ضمیر کے استعمال سے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ لہٰذا، اگر داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف اور موسیٰ و ہارون نسلاً خاندان نوح علیہم السلام میں سے ہیں تو خط کشیدہ مقام پر 'مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ' کے بجائے 'من ذریتهما' کیوں نہیں ہے؟

۳؎ واضح رہے کہ یہ اس وقت پیچیدہ نہیں رہتا، جب اسے اس معنی میں لیا جائے، جو میں نے بیان کیے ہیں۔ اس صورت میں اس اسلوب کے اختیار کرنے کی وجہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت نوح کے اس ہم سفر کا نام چونکہ ہم نہیں جانتے، اس لیے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ ؕ كُلًّا هَدَيۡنَا ۚ وَنُوۡحًا هَدَيۡنَا مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِهٖ[1] دَاوٗدَ وَسُلَيۡمٰنَ وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡسُفَ وَمُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ. (الانعام ۶:۸۴)

''(پھر یہی نہیں)، ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عنایت فرمائے۔ اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی۔ اِس سے پہلے یہی ہدایت ہم نے نوح کو بخشی تھی اور اس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ ہم نیکوکاروں کو اِسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔'' (ترجمہ از البیان)

ج: نوح علیہ السلام کے علاوہ سوار لوگوں کی اولاد میں نبی ہونے کی بشارت۔ اگر یہ کہا جاتا کہ نبوت صرف اولاد نوح کے لیے خاص ہے تو پھر مذکورہ بالا آیات سے پیدا ہونے والے تناقض کو فراموش کرتے ہوئے ماننا پڑتا کہ بنی اسرائیل اولاد نوح میں سے ہی مانے جائیں، کیونکہ اگر اولاد نوح کے علاوہ کسی میں نبی نہ آئے ہوتے تو ثابت ہو جاتا کہ ابراہیم اولاد نوح ہی میں سے تھے۔ لیکن ذیل کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت خاندان نوح علیہ السلام کے علاوہ کشتی میں سوار بعض خانوادوں کو بھی ملی ہے۔ آیت کریمہ یوں ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنۡ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ وَّمِنۡ ذُرِّيَّةِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡرَآءِيۡلَ وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَاجۡتَبَيۡنَا ؕ اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُ الرَّحۡمٰنِ خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا. (مریم ۱۹:۵۸)

''یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پیغمبروں میں سے اپنا فضل فرمایا، آدم کی اولاد میں سے اور اُن کی نسل سے جسے ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا، اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور اُن لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا تھا۔ اُن کو جب خداے رحمٰن کی آیتیں سنائی جاتی تھیں تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے جاتے تھے۔'' (ترجمہ از البیان)

یہ آیت بھی دیکھیے، 'وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ' میں بقا و برکات نسل نوح کے علاوہ کے لیے مذکور ہیں:

قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ. (ہود ۱۱:۴۸)

''ارشاد ہوا: اے نوح، اتر جاؤ، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ، تم پر بھی اور اُن امتوں پر بھی جو اُن سے ظہور میں آئیں گی جو تمھارے

---

[1] اس ضمیر کا یوں لانا، صاف واضح کر رہا ہے کہ قرآن اپنے پڑھنے والوں کو متنبہ کرنا چاہتا ہے کہ یہ انبیا حضرت نوح علیہم السلام کی نسل سے نہیں ہیں۔

ساتھ ہیں۔ اور کچھ ایسی امتیں بھی ہیں جنھیں ہم آگے بہرہ مند کریں گے، پھر (ان میں رسول آئیں گے، اگر وہ ہمارے رسولوں کو جھٹلائیں گے تو[5]) اُن کو بھی ہماری طرف سے ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کے خانوادے کے علاوہ نسلیں بھی دنیا میں موجود ہیں، اور ان میں نبوت بھی جاری ہوئی۔ تو ان سے یہ تردد زائل ہو گیا ہوگا کہ ان کے خاندان کے باہر نبوت نہیں ہو سکتی۔

۴۔ ذیل کی آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ذریت نوح کا ذکر علی الاطلاق نہیں کرنا چاہتے۔ اگر انعام یافتگان اور انبیا صرف اولاد نوح میں سے تھے تو 'ذرية آدم' ہی کی طرح 'ذرية نوح' کہنا کافی تھا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنۡ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ وَّمِنۡ ذُرِّيَّةِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡرَآءِيۡلَ وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَاجۡتَبَيۡنَا اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُ الرَّحۡمٰنِ خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا. (مریم ۱۹: ۵۸)

''یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پیغمبروں میں سے اپنا فضل فرمایا، آدم کی اولاد میں سے اور اُس شخص کی نسل سے جسے ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا، اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور اُن لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا تھا۔ اُن کو جب خداے رحمٰن کی آیتیں سنائی جاتی تھیں تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے جاتے تھے۔''

اس آیت میں خط کشیدہ الفاظ کو دیکھیے کہ آدم، ابراہیم اور اسرائیل علیہم السلام کے ساتھ براہ راست 'ذریت' کا لفظ آیا ہے، لیکن حضرت نوح کے ساتھ نہیں آیا۔ حضرت نوح کے لیے وہی پیچیدہ[6] اسلوب: 'وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ' آیا ہے۔ لہٰذا یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہاں بھی اولاد نوح کے ساتھ کچھ اور کا ذکر بھی پیش نظر ہے۔ اگر کشتی میں بس انھی کی اولاد سوار تھی یا کم از کم نبوت ہی ان کی اولاد میں محدود ہوتی تو 'و من ذرية نوح' کہنا کافی تھا۔ یہاں بھی اسلوب وہی ہے جو اوپر سورۂ بنی اسرائیل میں اختیار کیا گیا ہے۔ سورۂ مریم اور سورۂ بنی اسرائیل کے اس موازنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت نوح کے کسی ساتھی کا معاملہ حضرت نوح کی طرح کا ہے، وگرنہ مطلقاً حضرت نوح کا ذکر ہونا موزوں تھا۔

۵۔ یہ حذف ہم نے اس آیت کی وجہ سے کھولا ہے: ...'وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ حَتّٰى نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا' (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۵)۔ باقی ترجمہ استاذی الجلیل کی تفسیر ''البیان'' سے ہے۔

۶۔ دیکھیے حاشیہ ۳۔

۵۔ ذیل کی آیت کی وجہ سے کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ خود قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذریت نوح ہی دنیا میں باقی رہی، باقی سب ہلاک ہو گئے اور وہ آیت یہ ہے:

وَلَقَدْ نَادٰنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ. وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ. وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ. (الصافات ۳۷: ۷۵-۷۷)

''نوح نے ہم سے فریاد کی تھی۔ پھر (دیکھو کہ) ہم کیا خوب فریاد سننے والے ہیں! ہم نے اُس کو اور اُس کے اہل وعیال کو بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ اور ہم نے ٹھیرایا کہ اس کے بچے تو لازماً بچیں گے۔''

ہمارے خیال میں 'هُمُ الْبٰقِيْنَ' میں حصر کا اسلوب نہیں، بلکہ تاکید کا ہے۔ لیکن یہ حصر کا اسلوب بھی لیا جائے تو اس بات کو مستلزم نہیں کہ نوح علیہ السلام کی اولاد کے سوا سب لوگ مارے گئے، بلکہ یہ اپنے موقع و محل کے لحاظ سے صرف ان کے دشمنوں کے مقابل میں بولا گیا ہے، جو آپ کو مار دینے کی دھمکیاں دے رہے تھے[۷]۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ نوح کو ستانے والوں کے مقابلے میں نوح علیہ السلام کے اہل خانہ ہی تو تھے جو بچائے گئے۔ یعنی یہ جملہ اسی معنی میں آیا ہے جس معنی میں سورۂ بقرہ کا یہ جملہ: 'اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ' (۲: ۱۲) ہے۔ وہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ پوری دنیا میں بس وہ منافقین ہی 'مُفْسِدُوْنَ' تھے، اور کوئی مفسد نہیں تھا، بلکہ مراد یہ تھی کہ صحابہ نہیں، بلکہ یہ منافقین ہی مفسد ہیں۔ ٹھیک اس آیت کا مطلب بھی یہ ہے کہ دشمنانِ نوح نہیں، بلکہ ذریتِ نوح کے افراد ہی بچائے گئے۔ اس آیت میں باقی اہل ایمان کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے، یہ صرف اولاد نوح کے بارے ہی میں ہے، اس لیے کہ یہ اہل ایمان کے مقابل میں نہیں، بلکہ کفار کے مقابل میں بولا گیا ہے۔

اگر اہل ایمان نہیں بچائے گئے تو یہ بات قانون رسالت کے عمومی اصول ـــــ کہ عذاب کے وقت تمام اہل ایمان کو بچایا جاتا ہے ـــــ کے خلاف ہو جائے گی۔ اوپر دونوں باتیں واضح ہیں: ایک یہ کہ اہل خانہ کے علاوہ لوگ ایمان لائے تھے، اور دوسرے یہ کہ کشتی میں اہل خانہ کے علاوہ اہل ایمان سوار کیے گئے تھے۔ یعنی وہ ـــــ قانونِ رسالت کے عین مطابق ـــــ ہلاک نہیں کیے گئے۔ اس لیے مندرجہ بالا آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ خانوادۂ نوح کے سوا کوئی بچا ہی نہیں۔ قرآن کی صریح نص موجود ہے کہ غیر خاندان کے اہل ایمان کو کشتی میں سوار کر کے بچایا گیا تھا۔

لہٰذا اس استدلال سے لازماً ثابت ہو جاتا ہے کہ:

۱۔ دنیا میں اولادِ نوح کے علاوہ اقوام و ملل بھی موجود ہیں۔

---

۷ 'قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ' (الشعراء ۲۶: ۱۱۶)۔

۲۔ کشتی میں نوح علیہ السلام ان کے بہو بیٹے، اور دیگر اہل ایمان سوار ہوئے اور قانون رسالت کے تحت عذاب سے بچا رکھے گئے۔ بعد میں ان سب پر برکات ہوئیں، ان سب سے امتیں پیدا ہوئیں، اور ان میں سے بعض میں ـــــ اولاد نوح سمیت ـــــ نبوت بھی جاری ہوئی۔

۳۔ بنی اسرائیل اولاد نوح نہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ابراہیم، جو اسرائیل (حضرت یعقوب) کے سگے دادا ہیں، وہ بھی اولاد نوح علیہم السلام سے نہیں ہیں۔

نقدِ احباب کا جائزہ

یہ میرا استدلال تھا، جسے نئی ترتیب اور مزید توضیح کے ساتھ اوپر دہرادیا ہے۔ اب ان اعتراضات وسوالات کا جائزہ لیتے ہیں، جو میرے احباب کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بیان، اعتراض یا سوال ایسا سامنے نہیں کہ جس سے میری رائے کی غلطی ثابت ہوئی ہو۔ ذیل میں ایک ایک نکتے کو لے کر اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ حضرت ابراہیم کے اولاد نوح میں سے ہونے کے ثبوت میں یہ آیت پیش کی گئی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ. ذُرِّيَّةًۢ بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ. (آل عمران ۳: ۳۳-۳۴)

''اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ نے آدم اور نوح کو، اور ابراہیم اور عمران کے خاندان کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اُن کی رہنمائی کے لیے) منتخب فرمایا۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔...'' (ترجمہ انھی دوست کا ہے)

اس آیت سے ہمارے مضمون کے خلاف جو استدلال کیا گیا ہے، وہ ذیل میں ہمارے دوست ہی کے الفاظ میں یوں ہے:

''''ایک دوسرے کی اولاد ہیں''، اس جملے کا یہ مطلب، ظاہر ہے کہ نہیں لیا جا سکتا کہ ان میں سے ہر کوئی ایک دوسرے کا باپ بھی ہے اور اولاد بھی، بلکہ اس کا ایک ہی مطلب بنتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ ایک ترتیب سے ایک دوسرے کی اولاد ہیں[۸]، یعنی نوح آدم کی اولاد ہیں، آل ابراہیم نوح کی اور آل عمران ابراہیم کی۔''

(ماہنامہ ''اشراق'' نومبر ۲۰۱۸ء، ۵۶)

یہ ساری بات ہرگز درست نہیں ہے کہ 'بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ' میں ترتیب کا مفہوم ہوتا ہے۔ نہ اس مرکب میں یہ مفہوم عموماً ہوتا ہے، اور نہ یہاں کلام میں اس مفہوم کے ادخال کے لیے کوئی قرینہ یا گنجایش موجود ہے۔ اگر ان کی

۸۔ اس جملے میں ''ترتیب'' اور پھر ''ایک دوسرے کی اولاد''، جمع نقیضین کی نہایت صریح مثال ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مراد یہ ہے کہ 'بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ' کے مرکب میں ترتیب اس کا لازمی حصہ ہے تو یہ بے بنیاد بات ہے۔ مثلاً ذیل کی آیت دیکھیے: 'اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ' (التوبہ ۹: ۶۷) کیا ہم اس کا ترجمہ یوں کر سکتے ہیں کہ ''منافق مرد اور منافق عورتیں، بالترتیب ایک دوسرے سے ہیں''؟ یقیناً نہیں۔ اس لیے یہ استدلال بداہۃً غلط ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب چار پانچ جگہوں پر آیا ہے کہیں بھی ترتیب کا مفہوم ان میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اصل مفہوم بلا ترتیب ایک دوسرے سے ہونا ہے۔

'بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ' کا مطلب بیانِ ماخذ ہوتا ہے، یہ بھی درست نہیں۔ عربی مبین اس سے اِبا کرتی ہے کہ یہاں بیانِ ماخذ کے معنی میں اس مرکب کو لیا جائے۔ پہلی بات یہ کہ 'بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ'، ایک دوسرے سے ہونے کا مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں دونوں اطراف میں سے ہونے کا مفہوم لازم ہے، اس دوطرفہ نسبت کے مفہوم سے اسے جدا نہیں کیا جا سکتا، جیسا ہمارے دوست نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ مرکب دراصل اس معنی میں بیانِ ماخذ کے لیے آتا ہی نہیں، جس معنی میں ہمارے ساتھی نے لے لیا ہے، بلکہ یہ دراصل مماثلت اور برابری وغیرہ کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی طرفین میں یکسانیت، برابری، ہم مشربی اور عدم تفاوت پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں آیا ہوا 'مِنْ' وہی مفہوم رکھتا ہے، جیسا حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایتوں میں آتا ہے کہ 'حسين مني وأنا من حسين' (مسند احمد، رقم ۱۷۱۱۱)۔ یعنی حسین اور میں مماثل ہیں۔ یہی مفہوم 'بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ' کا ہوتا ہے۔ 'أنا من حسين' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں حسین کی اولاد ہوں، اور نہ 'حسين مني' میں یہ مراد ہے۔ یعنی یہی جملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق کے لیے بھی بول سکتے تھے۔ قرآن میں تقریباً تمام مقامات پر یہ اسلوب اسی معنی میں آیا ہے: مثلاً سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیات کے ساتھ یہ آیت بھی دیکھیے: '...اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ' (آل عمران ۳: ۱۹۵)[9]۔ لہٰذا اس جملے کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ وہ صرف ایک طرف سے بالترتیب پہلے لوگوں کی اولاد ہیں۔ اس کا مطلب صرف اور صرف یہی ہے کہ پہلے والے بعد والوں میں سے ہیں اور بعد والے پہلے والوں میں سے۔ اس دوطرفہ نسبت کی نفی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہمارے دوست نے جو ترجمہ کیا ہے، وہ لسانی نہیں محض منطقی ہے۔ زبان کو اس کے منطقی نہیں لسانی مفاہیم اور مبین معنی میں لینا ہی اصل الاصول ہے۔

'ذرية' کا لفظ شاید اس غلطی کا سبب بنا ہوگا۔ 'ذرية' کا لفظ صرف ''آل اولاد'' کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ ''لوگوں''،

۹۔ ہمارے دوست کے بتائے ہوئے اصول پر اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے: عورت بالترتیب مذکر سے ہے۔ ظاہر ہے، یہ مرکب ترتیب اور صرف ایک طرف سے ہونے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے آتا ہی نہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یعنی ’بنی نوع آدم‘ کے معنی میں بھی آجاتا ہے۔ اس معنی میں یہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے:

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ. (یٰسٓ ۳۶: ۴۱)

”اور اِن کے لیے ایک بہت بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اِنھی کی ذریت (لوگوں[10]) کو ہم نے بھری ہوئی کشتیوں میں اٹھا رکھا ہے۔“

ہمارے خیال میں آل عمران کی زیر بحث آیت میں بھی یہ اسی معنی میں آیا ہے، اس لیے اس تکلف کی ضرورت ہی نہیں کہ ’بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ‘ کو اس کے عام مفہوم سے ہٹایا جائے۔

ہمارے معترض دوست نے سیاق وسباق کا خیال بھی نہیں رکھا۔ یہ موقع ومحل سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی عدم الوہیت پر استدلال کا ہے۔ بتایا جارہا ہے کہ آل ابراہیم اور آل عمران، دونوں کے گھرانے ابنائے آدم پر مشتمل ہیں۔ یہ سب لوگ انسان ہیں، جو ایک جیسے ہیں۔ لہٰذا آل عمران میں ظاہر ہونے والے ابن مریم بھی ان جیسے انسان ہی ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے ہیں، ان میں سے کوئی بھی الوہی نہیں ہے۔ اسی لیے اس آیت میں آل عمران کے ذکر کے فوراً بعد عیسیٰ علیہ السلام کی نیک طینت نانی کا ’اِمْرَاَتُ عِمْرٰنَ‘ کے الفاظ میں ذکر کرکے اس استدلال کو محکم کیا گیا ہے۔ یعنی آدم ونوح اور آل ابراہیم جیسی ہی ایک آل سے حضرت عیسیٰ منتخب کیے گئے۔ جو ایک نیک بی بی کی نذر سے ملنے والی بیٹی مریم کے بطن سے تھے۔

لسانی ذوق کا تقاضا ہے کہ ’ذریة‘ کا لفظ اگر اولاد یا نسل کے معنی میں لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ آل ابراہیم اور آل عمران کا بدل مانا جائے، نوح اور آدم کا نہیں۔ اس لیے کہ ان کے لیے ’ذریت‘ کا لفظ بطور بدل درست نہیں، کیونکہ ذریت کے معنی آل، اولاد اور نسل کے ہیں۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ:

ہم نے آدم اور نوح کو چنا، یعنی اولاد کو چنا جو ایک دوسرے سے تھی۔

یہاں دیکھ لیجیے ’اولاد‘ کا لفظ نوح وآدم دونوں کے لیے درست بدل نہیں ہے۔ واضح ہے کہ یہاں ذریت —— بمعنی اولاد —— صرف آل کا بدل ہوسکتا ہے۔ لیکن فرض کرلیجیے کہ توسعاً استعمال ہوا ہو تو تب بھی حضرت آدم کو یہ ہرگز شامل نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ کسی معنی میں بھی ذریت نہیں تھے۔[11] اس لیے مزعومہ ترتیب کا دعویٰ غلط ہوجاتا ہے۔

---

[10] ’لوگوں‘ ترجمہ ہے ’ذُرِّيَّتَهُمْ‘ کا۔ استاذی الجلیل، اس آیت میں موجود لفظ ’ذریت‘ پر نوٹ لکھتے ہوئے رقم فرما ہیں:

”یعنی اِن کے ابنائے نوع کو۔ اِس سے بنی آدم مراد ہیں۔“

[11] سوائے اس کے کہ ذریت کو کسی غیر معروف معنی میں لیا جائے۔ جیسے بعض لوگوں نے ’آبا‘ کے معنی میں لیا ہے۔

لہٰذا، ہماری راے میں ذریت کو اگر اولاد اور نسل کے معنی میں لیا جائے تو صرف آخری دو خاندانوں کا بدل ہے۔ یعنی آل ابراہیم اور آل عمران۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زمخشری نے اسے صرف انھی دو کا بدل مانا ہے۔ لکھتے ہیں:

وذُرِّيَّةً بدل من آل إبراهيم وآل عمران بَعۡضُهَا مِنۢ بَعۡضٍ يعني أنّ الآلين ذرّية واحدة متسلسلة بعضها متشعب من بعض. (الکشاف ۱/۳۵۴)	''اور ذریت بدل ہے، آل ابراہیم و آل عمران سے، 'بَعۡضُهَا مِنۢ بَعۡضٍ' کا یہاں مطلب یہ ہے کہ دونوں خانوادے ایک نسلِ متسلسل ہیں، یہ ایک دوسرے کے شعوب ہیں۔''

لہٰذا سیاق و سباق سے واضح ہے کہ آیت کے معنی بس یہ ہیں کہ حضرت عیسیٰ آل ابراہیم اور آل عمران کے فرزند ہیں، اور انھی کے جیسے ہیں۔ یہاں 'ذُرِّيَّةً بَعۡضُهَا مِنۢ بَعۡضٍ' یہ بتانے آیا ہی نہیں ہے کہ یہ ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں، بلکہ یہ بتانے آیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سمیت تمام انبیا و رسل بنی آدم ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کا یہ واحد مقام ہے جہاں آل عمران کے 'اصۡطَفٰی'، اور عمران کی بیوی کا ذکر ہوا ہے۔ پورا قرآن اس مضمون سے خالی ہے۔ لہٰذا اس جملے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ بالترتیب نسلوں کا ذکر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آدم و نوح کو چنا، آل ابراہیم و آل عمران کو چنا۔ حضرت عیسیٰ اسی آخری خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ لہٰذا خدا کیسے ہوئے؟ اور ابن اللہ کیسے ہوئے؟

دوسرے یہ کہ مذکورہ بالا آیات میں 'ذُرِّيَّةَ مَنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ' اور 'مِنۡ شِيۡعَتِهٖ' والی آیات صریح ہیں، جب کہ یہاں محض اشارہ سا ہے، اس لیے اشارہ کو صراحت کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

۲۔ قرآن کا اصلاحِ تورات کا طریقہ

ہمارے دوست نے ایک دل چسپ استدلال اختیار کیا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ قرآن مجید یہ انکشاف کر رہا ہے، اور یوں وہ اہل کتاب کی غلطی بتا رہا ہے کہ ابراہیم اولاد نوح علیہما السلام نہیں ہیں۔ ان صاحب کا کہنا ہے کہ قرآن یوں نہ انکشاف کرتا ہے اور نہ بائیبل کی تصحیح کرتا ہے۔ آیئے، پہلے ان کا استدلال انھی کے الفاظ میں سن لیں، پھر ہم اس کا جائزہ لیں گے:

> ''اس سے پہلے کہ ہم اصل حقیقت کو قرآن میں سے واضح کریں، ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کے اُس انداز کو واضح کر دیں جو تورات کے بیان کی اصلاح یا اُس کی تردید کرتے ہوئے وہ عام طور پر اپنایا کرتا ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تورات کا بیان یہ ہے کہ اُنھوں نے معجزہ دکھاتے ہوئے جب اپنا ہاتھ باہر نکالا تو وہ کوڑھ سے برف کے مانند سفید تھا[۱۲]۔ قرآن نے جب یہ واقعہ بیان کیا تو بڑے ہی واضح انداز میں یہ کہتے

۱۲؎ کتاب خروج ۴:۶۔

ہوئے اس کی اصلاح کی: 'تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ'[13]، یعنی یہ ہاتھ بغیر کسی بیماری کے سفید ہوتا تھا۔ اسی طرح تورات میں بیان ہوا ہے کہ خداوند نے چھ دن میں زمین و آسمان کی تخلیق کی اور ساتویں دن آرام کیا[14]۔ قرآن نے یہ کہتے ہوئے بڑی صراحت سے اس کی تردید کی: 'وَمَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ'[15]، کہ ہمیں کوئی تکان لاحق نہیں ہوئی۔ بلکہ اگر کوئی غلطی بہت زیادہ سنگین ہو اور لوگوں میں اس کا عام رواج بھی ہو چکا ہو اور قرآن کو اس کے جواب میں واقعی کوئی انکشاف کرنا ہو تو اس کے لیے وہ محض اشارے کنایے میں اور محض ضمیروں کی دلالت سے بات نہیں کرتا، بلکہ انکشاف ہی کے طریقے سے اسے بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، یہود سیدنا مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کا دعویٰ کرتے تھے، انجیلوں میں بھی یہی کچھ نقل کر دیا گیا تھا، اور اسے کم و بیش ہر مسیحی فرقے میں مان لیا گیا، یہاں تک کہ نزول قرآن کے وقت اسے گویا ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی؛ اس پر قرآن نے اصل حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ کتنے زوردار طریقے سے بتایا ہے: 'وَمَا قَتَلُوۡہُ وَمَا صَلَبُوۡہُ وَلٰکِنۡ شُبِّہَ لَہُمۡ' (اُنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی، بلکہ معاملہ اُن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا)، یعنی پہلے اُن کی بات کی ہر دو پہلو سے تردید کی اور پھر اِن کو جہاں سے غلطی لگی تھی، اس بنیاد کی بھی وضاحت کی، بلکہ پھر سے دہرا کر اصل بات کو موکد کیا: 'وَمَا قَتَلُوۡہُ یَقِیۡنًا'[16]، کہ اِنھوں نے ہرگز اُس کو قتل نہیں کیا۔ غرض یہ ہے کہ تورات کے بیان کی تردید کرتے ہوئے قرآن کو اگر یہ بتانا ہوتا کہ وہ نوح کے بجائے کسی اور کی اولاد ہیں تو وہ اپنے معروف طریقے کے مطابق ہی بتاتا، نہ کہ اس طرح بتاتا کہ اسے جاننے کے لیے بڑے باریک اور منطقی استدلال کی ضرورت آن پڑتی۔''

(ماہنامہ ''اشراق'' نومبر ۲۰۱۸ء، ۵۵)

یہ سارا پیراگراف آنکھوں میں دھول جھونکنے کے عمل سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ بائیبل کی اصلاح کے ضمن میں جتنے حوالے قرآن سے بطور مثال دیے گئے ہیں، وہ سب کے سب کنایے ہی ہیں۔ مثلاً، ان میں سے کس آیت میں کہا گیا ہے کہ میں اہل تورات کی غلطی بتا رہا ہوں؟ کہیں بھی نہیں۔ بس کہیں ایک جملہ اضافہ کر دیا، تو کہیں دو۔ یہاں بھی قرآن مجید نے دو مقامات پر 'ذُرِّیَّۃَ مَنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ' کا جملہ بڑھا دیا ہے، ایک مقام پر 'مِنۡ شِیۡعَتِہٖ' بڑھا دیا ہے۔ ایک مقام پر ضمیر کی گواہی دی ہے۔ اگر اب بھی یہ محض باریک منطقی استدلال ہی ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ پھر 'مَا مَسَّنَا مِنۡ

---

[13] طٰہٰ ۲۰: ۲۲۔

[14] خروج ۲۰: ۱۱۔

[15] ق ۵۰: ۳۸۔

[16] النساء ۴: ۱۵۷۔

لُغُوْبٍ' اور'مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ' اور مذکورہ بالا دونوں جملوں: 'ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ' اور 'مِنْ شِيْعَتِهٖ' میں وہ کیا فرق ہے کہ ایک جملہ واضح بات قرار پاتا ہے اور دوسرا محض اشارہ۔ خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیے!

رہا صلیبِ عیسیٰ کا معاملہ تو وہ قرآن کے قانون رسالت کی نفی کرنے والا واقعہ ہے، اس لیے اس کے لیے واضح تر الفاظ آ گئے ہیں۔ ابراہیم کا ذریت نوح ہونا، اتنا ہی اہم ہوگا جتنا ساتویں دن آرام کرنا۔ اسی لیے ساتویں دن آرام کی تردید کے لیے ایک جملہ: 'مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ' کفایت کر گیا، اور حضرت ابراہیم کے لیے تین مقامات پر تصریح کفایت کر گئی۔ حضرت موسیٰ کے ید بیضا کے لیے بھی 'مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ' کا غیر محسوس سا اضافہ کفایت کر گیا۔ لہٰذا قرآن کا معروف اسلوب تو وہی ہوا جو اس نے تین باتوں کی تردید کے لیے اختیار کیا، حضرت عیسیٰ والا معاملہ معروف اسلوب سے ہٹ کر ہے، اس لیے اسے مثال نہیں بنایا جا سکتا، بلکہ مجھے لگ رہا ہے کہ ابراہیم کا نوح علیہما السلام سے تعلق کا معاملہ بھی معروف اسلوب سے ہٹ کر ہے، اس لیے کہ اس کے لیے دو مقامات پر واضح الفاظ، اور ایک جگہ پر ضمائر سے اشارات ہیں۔ اتنی اہمیت تو صلیبِ عیسیٰ کے معاملہ کو بھی نہیں ملی۔ جس کے لیے ایک ہی مقام پر تصریح پر انحصار کیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ بات بھی عرض کی تھی کہ حضرتِ نوح کے اہل کے لیے کشتی میں سوار ہونے کے لیے اہل میں سے ہونا کافی تھا۔ ہمارے دوست نے ذیل کی آیت کی بنیاد پر آلِ نوح کے لیے ایمان کی شرط لازم قرار دی ہے۔ الفاظ کی حد تک یہاں تعین کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ یا کم از کم ہمارے ناقد نے بیان نہیں کی ہے۔ غالباً قانونِ رسالت کا ایک عمومی ضابطہ ان کے پیش نظر ہے، میں اس کا قائل ہوں، اور اس کا بھی قائل ہوں کہ کلام میں ایسے ضوابط کا ذکر کیے بغیر بھی کلام میں یہ خود بخود موجود ہوتے ہیں۔ لیکن کیا یہ قاعدہ یہاں اس آیت میں بھی ہے، میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ آیت پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ یہاں لفظوں میں کوئی قرینہ ایمان کی طرف اشارہ نہیں کرتا، بلکہ 'وَمَنْ اٰمَنَ' کا عطف ایمان کے بجائے رشتہ داروں کی طرف دلالت کرتا ہے۔ آیت یہ ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ[۷] اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ. (ہود ۱۱: ۴۰)

''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور طوفان ابل پڑا تو ہم نے کہا: ہر قسم کے جانوروں میں سے نر و مادہ، ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اور اپنے گھر والوں کو بھی (اِس کشتی میں سوار کرا لو)، سوائے اُن کے جن کے

۷؎ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کے اہل خانہ کے لیے ایمان کی شرط نہیں تھی۔

بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔‘‘

لہٰذا، میرے خیال میں یہاں ایمان کے بجاے اہل میں سے ہونے کی شرط کا قرینہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ ’اَهْلَكَ‘ پر اہل ایمان کا عطف ہوا ہے۔[18] دوسرے یہ کہ میری راے کے حق میں دیگر قرآنی نصوص موجود ہیں۔ جو ایمان کے بجاے اہل خانہ ہونے پر واضح تر لفظوں میں دلالت کر رہی ہیں۔ مثلاً ذیل کی آیت میں دیکھیے کہ بیٹے کو ’مِنْ اَهْلِی‘ کہا گیا۔ بیٹا جو کہ ہوتا ہی اہل میں سے ہے، اسے ’مِنْ اَهْلِی‘ کیوں کر کہا جائے گا؟ صرف اسی لیے کہ حضرت نوح اس بات کو بطور دلیل پیش کر رہے تھے کہ اہل میں سے ہونا شرطِ نجات تھا اور یہ خدا کے ہاں بھی تسلیم شدہ شرط تھی۔ اگر ایمان شرطِ نجات ہوتی تو جملہ یوں ہوتا ’اِنَّ ابْنِی مِنَ المؤمنین‘، کہ میرا بیٹا صاحب ایمان ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بیٹے کو ’مِنْ اَهْلِی‘ کہہ کر اس شرط کو ’وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ‘ کے الفاظ میں وعدۂ الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ دل جمعی کے لیے آیت پر نگاہ ڈال لیجیے:

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ. قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ. (ہود ۱۱: ۴۵-۴۶)

’’نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ پروردگار، میرا بیٹا تو میرے گھر والوں میں سے ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب منصفوں سے بڑھ کر منصفانہ فیصلہ کرنے والا ہے۔ فرمایا: اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ فعلِ نابکار ہے۔[19] سو مجھ سے اُس چیز کے بارے میں سوال نہ کرو جس کا تجھے کچھ علم نہیں ہے۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔‘‘

۱۸؎ واضح ہے کہ یہاں یہ اسلوب اختیار نہیں کیا گیا، جو حضرت شعیب کے بارے میں اس آیت میں ہے: ’وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ‘ (ہود ۱۱: ۹۴)۔

۱۹؎ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ تحریم کی دسویں آیت۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دوسرے یہ کہ اگر اللہ کے نزدیک بھی ایمان ہی شرط نجات تھی، تو اللہ 'اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ' کو رد کرتے اور کہتے کہ وہ اہل میں سے تو ہے، مگر اہل ایمان میں سے نہیں۔ اللہ نے تو وہ جواب دیا ہے جس سے میرے فہم کی تصدیق ہوتی ہے کہ اہل نوح کو نجات کا وعدہ تھا، لیکن بیٹے کو اس لیے نہیں بچایا گیا کہ وہ اہل ہی میں سے نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہیں: 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ'، اس لیے قرآن کے الفاظ واضح طور پر یہ بیان کر رہے ہیں کہ ان کے اہل خانہ کو بچایا گیا تھا، جس میں اہل خانہ ہونا ہی شرطِ نجات تھی۔

اگر اہل ایمان ہی کو بچانا مقصود تھا، تو اس درازگوئی کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اہل خانہ کا ذکر الگ سے کیا گیا اور اہل ایمان کا الگ سے۔ بس سادہ بات کہہ دی جاتی کہ ان ان جانوروں کو بھی سوار کر لو، اور اہل ایمان کو بھی۔ اس تفصیل کی ضرورت سمجھ نہیں آتی۔ سوائے اس کے جو بات ہم عرض کر رہے ہیں، وہ پیش نظر ہو۔

یہاں ازراہ اطمینان کچھ مزید باتوں کی طرف اشارہ مفید رہے گا۔ ایک یہ کہ بنی اسرائیل کا مصر سے اخراج اور فرعون کے ساتھ غرق ہونے سے نجات بشرط ایمان نہیں تھی، بلکہ صرف اسرائیلی ہونے کی بنا پر تھی۔ ان کے ایمان کی حالت تو قدم قدم پر خروج از مصر سے پہلے اور بعد میں واضح ہی تھی، جس کے چیدہ چیدہ پہلو سورۂ بقرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سلسلۂ رسالت و نبوت میں نوح علیہ السلام ہی کے بعد[۲۰] سے ذریت انبیا کو ایک اہمیت رہی ہے۔ حضرت نوح برگزیدگی پاتے ہیں، لیکن اس ذاتی برگزیدگی کا صلہ یہ ملتا ہے کہ ان کی اولاد میں آمد انبیا کا وعدہ بھی شامل ہو جاتا ہے[۲۱]۔ انبیا کے اہل بیت کو عموماً ایک اہمیت رہی ہو گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو بھی ایک اہمیت حاصل رہی ہے۔ سورۂ تحریم اور سورۂ احزاب میں اس اہمیت کو بھانپا جا سکتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲۰؎ ان سے پہلے کی معلومات میسر نہیں ہیں، ہو سکتا ہے پہلے بھی ایسا رہا ہو۔

۲۱؎ مثلاً دیکھیے: 'وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ' (الحدید ۵۷: ۲۶)۔ قرآن میں سورۂ انعام (۶) کی آیات ۸۴ تا ۸۷ والا مقام بہت دل نواز ہے۔ آیت ۸۴ میں 'وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ' اور ۸۶، ۸۷ میں 'وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ. وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ' پر خاص طور سے نگاہ ڈالیے۔ حضرت ابراہیم کو امامت پر سرفراز کیا جاتا ہے، تو وہ ذریت میں اس کے اجرا کا مطالبہ کرتے ہیں (البقرہ ۲: ۱۲۴)۔ سورۂ عنکبوت (۲۹) میں ابراہیم علیہ السلام کے بارے ہی میں آیا ہے: 'وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ' (۲۷)۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اولاد، آبا اور اخوان وغیرہ میں چناؤ میرٹ پر ہی ہوا کرتا تھا۔

حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کے معاملے میں کوئی وجہ ہے کہ اہل کا ذکر بطور خاص ہوا ہے۔ حضرت نوح سے متعلق آیات اوپر آ چکی ہیں، ان کا دوبارہ حوالہ باعث طوالت ہوگا۔ البتہ حضرت لوط سے متعلق چند آیات پیش ہیں:

قَالُوۡا یٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنۡ یَّصِلُوۡۤا اِلَیۡكَ فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَلَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَكَ اِنَّهٗ مُصِیۡبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمۡ اِنَّ مَوۡعِدَهُمُ الصُّبۡحُ اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ. (ہود ۱۱:۸۱)

”فرشتوں نے کہا: اے لوط، ہم تمھارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (مطمئن رہو)، یہ تمھارے قریب بھی نہیں آ سکیں گے۔ سو اپنے اہل وعیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ تمھاری بیوی نہیں، اِس لیے کہ اُس پر وہی کچھ گزرنے والا ہے جو اِن لوگوں پر گزرنا ہے۔ اِن (پر عذاب) کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے۔ (تم پریشان کیوں ہوتے ہو)؟ کیا صبح قریب نہیں ہے!“ (ترجمہ از البیان)

دیکھ لیجیے، خاندان کی بات ہوئی ہے اور خاندان میں سے جیسے حضرت نوح کے بیٹے کو خارج سمجھا گیا، یہاں حضرت لوط کی بیوی کو خارج از اہل بیت سمجھا گیا:

قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ. اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ اِنَّا لَمُنَجُّوۡهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ. اِلَّا امۡرَاَتَهٗ قَدَّرۡنَاۤ اِنَّهَا لَمِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ. (الحجر ۱۵:۵۸-۶۰)

”فرشتوں نے جواب دیا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ صرف لوط کے گھر والے مستثنیٰ ہیں۔ اُن سب کو ہم لازماً بچا لیں گے۔ اُس کی بیوی کے سوا۔ ہم نے ٹھیرا لیا ہے کہ وہ اُنھی میں ہو گی جو پیچھے رہ جائیں گے۔“ (ترجمہ از البیان)

اس مضمون کی آیتوں[۲۲] میں دیکھ لیجیے کہ آل لوط کے بچائے جانے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے لفظوں کا یہ چناؤ خاص پہلو رکھتا ہے، جو تحقیق طلب ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ عذاب کے موقع پر بچانے کے لیے ایمان کے بجائے 'اہل' کا ذکر کیا گیا ہے؟ ان دونوں انبیاے عظام کی دعائیں بھی کچھ اسی مضمون کی ہیں[۲۳]، جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کے

---

[۲۲] اسی مضمون کی ایک آیت یہ ہے: 'کَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطٍۭ بِالنُّذُرِ. اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ نَجَّیۡنٰهُمۡ بِسَحَرٍ'، ”قوم لوط نے بھی تنبیہ کو جھٹلا دیا۔ ہم نے اُن پر پتھر برسانے والی ہوا مسلط کر دی۔ صرف لوط کے گھر والے اُس سے محفوظ رہے۔ ہم نے خاص اپنی عنایت سے اُن کو صبح دم نکال دیا۔“ (القمر ۵۴:۳۳-۳۴۔ ترجمہ از البیان)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اہل خانہ کو دعوت کے کسی خاص مرحلے پر یہ اہمیت حاصل ہوئی ہو۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں نصاریٰ کے خلاف مباہلے میں اہل خانہ کی ہلاکت ونجات معیار ودلیل قرار پائی تھی، ویسے ہی ان دونوں کی پوری دعوت ہی شاید مباہلہ نما بن گئی تھی، جن میں اہل خانہ کا بچایا جانا ان کے حق پر ہونے کی دلیل تھا۔ چنانچہ اسی مباہلہ نما صورت حال کے باوصف ان دونوں کے اہل خانہ کو ہر صورت بچایا گیا۔

۴۔ ''اشراق''، نومبر ۲۰۱۸ء میں طبع شدہ اس مضمون میں ایک دل چسپ تضاد بھی اسی بحث میں آپ کو ملے گا۔ مضمون کے پہلے حصے میں میری بات کو تسلیم کرلیا گیا، اور دوسرے حصے میں اسی آیت سے دوسرے معنی پر استشہاد کیا گیا ہے:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ کُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ. (ہود ۱۱: ۴۰)

''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور طوفان ابل پڑا تو ہم نے کہا: ہر قسم کے جانوروں میں سے نر و مادہ، ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اور اپنے گھر والوں کو بھی (اس کشتی میں سوار کرا لو)، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ

۲۳؎ نوح ولوط علیہما السلام کی یہ دعائیں ذیل میں ہیں۔

حضرت نوح کی دعا:

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ. (الانبیاء ۲۱: ۷۶)

''یاد کرو، اِن سب لوگوں سے پہلے جب نوح نے پکارا تو ہم نے اُس کی دعا قبول کی اور اُسے اور اُس کے اہل کو بڑی مصیبت سے نجات بخشی۔''

حضرت لوط کی دعا:

رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ. فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗٓ اَجْمَعِیْنَ. اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ.

(الشعراء ۲۶: ۱۶۹-۱۷۱)

''(تب لوط نے دعا کی): میرے پروردگار، تو مجھے اور میرے گھر والوں کو اُس عمل کے انجام سے نجات عطا فرما جو یہ کر رہے ہیں۔ سو ہم نے اُسے اور اُس کے سب گھر والوں کو نجات دی۔ ایک بڑھیا کے سوا جو پیچھے رہنے والوں میں رہ گئی۔'' (ترجمہ از البیان)۔

ان دونوں دعاؤں میں اہل ایمان کی نہیں اہل خانہ کی نجات طلب کی گئی ہے۔ اس پہلو کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن ان کے اہل کا اس اہتمام سے ذکر کیوں کرتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایمان لائے تھے۔‘‘(ترجمہ از البیان)

اس آیت کے بارے میں میری بات کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا گیا کہ (خط کشیدہ الفاظ نگاہ میں رہیں):

’’دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ یہاں ’وَمَنْ اٰمَنَ‘ کو ’اَهْلَكَ‘ پر عطف کیا گیا ہے۔ یہ مغایرت کا تقاضا کرتا اور یوں بڑی خوبی سے اس بات کو بیان کر دیتا ہے کہ نوح کو اپنے اہل کے علاوہ کچھ اور مومنین کو بھی سوار کرنے کا حکم ہوا تھا۔‘‘

(ماہنامہ ’’اشراق‘‘ نومبر ۲۰۱۸ء، ۴۷)

لیکن آگے چل کر اس بات کو فراموش کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’دو مقامات پر ’اَهْلَكَ‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے، مگر ان دونوں مقامات پر وہ اپنے عموم کے بجائے تخصیص میں ہوا ہے۔ یعنی، اس لفظ سے مراد تمام اہل وعیال سرے سے ہے ہی نہیں کہ اس سے کوئی شخص اہل ہونے کو نجات کی وجہ قرار دے۔ مذکورہ بالا آیت میں اس تخصیص کی دلیل اس لفظ کو استعمال کرنے کا موقع اور اس پر عطف ہونے والے ’وَمَنْ اٰمَنَ‘ کے الفاظ ہیں۔‘‘(ماہنامہ ’’اشراق‘‘ نومبر ۲۰۱۸ء، ۵۰)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نہ جانے وہ کون سی منطق ہے، جس سے ایک ہی لفظ ایک ہی آیت میں نقیضین کے لیے دلیل بن رہا ہو۔ یعنی ایک طرف یہ اہل وعیال سے مغایرت بن رہا ہو اور دوسری طرف وہ ان کے لیے ایمان کے لحاظ سے تخصیص کا باعث بھی ہو۔ مغایرت اور یہاں پیش نظر تخصیص ایک ساتھ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ مثلاً یہ جملہ دیکھیے کہ:

بیٹا اپنے بچوں کو اور پاکستانی بچوں کو لیتے آنا۔

’پاکستانی بچوں کو لیتے آنا‘ سے یہ تخصیص کیسے ہوگی کہ ’’اپنے بچے‘‘ بھی پاکستانی ہوں۔

۵۔ اس ضمن میں، یعنی ’’اہل کو محض اہل ہونے کی بنا پر کشتی میں سوار کرنے‘‘ کی میری رائے کے رد میں ایک اور دلیل دی گئی ہے کہ:

’’دوسرے اس پر آنے والا ’اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ‘ کا استثنا ہے جس نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ سوار ہونے کے اس حکم میں اہل سے آپ کے تمام اہل نہیں، بلکہ وہ خاص اہل مراد ہیں جن کے بارے میں خدا کے عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا۔ بلکہ دوسری جگہ پر اِس استثنا کے بعد آنے والے ’وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا‘[۲۴] کے الفاظ نے تو سلبی طریقے سے بھی اس تخصیص کو نمایاں کر دیا ہے۔‘‘(ماہنامہ ’’اشراق‘‘ نومبر ۲۰۱۸ء، ۵۰)

’اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ‘ کے الفاظ بلاشبہ تخصیص کر رہے ہیں۔ لیکن تخصیص کا جو پہلو یہاں بیان ہوا ہے:

۲۴؎ پورا جملہ یوں ہے: ’...فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ‘ (المومنون ۲۳: ۲۷)۔

''جن کے بارے میں خدا کے عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا''، اس کے تعین کی کوئی وجہ کلام میں موجود نہیں ہے۔ اگر بفرض محال میں اسے مان بھی لوں تو میں یہ کہوں گا کہ ہاں ابن نوح کے بارے میں یہ فیصلہ صادر ہو چکا تھا، اس لیے اس کے سوا باقی اہل خانہ سوار کر لیے گئے۔ لیکن یہ فیصلہ اس کے بارے میں کیوں صادر ہوا، اس کی ایمان کے علاوہ وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔ کلام میں کوئی وجہ ایمان سے تخصیص کی موجود نہیں ہے۔ 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' اس جملے کا جس طرح مصداق ''کافر ہونا'' ہو سکتا ہے، اسی طرح ''غیر اہل ہونا'' بھی ہو سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو اہل ہونے کے معیار پر پورا نہیں اترے گا، اسے سوار نہیں کیا جائے گا۔

رہا 'وَلَا تُخَاطِبْنِىْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' کا معاملہ تو مجھے اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ یہ جملہ تخصیص کے محل میں ہے۔ یہ جملہ محض تنبیہ و تاکید کا ہے کہ جب ظالم غرق ہوں تو اس وقت آپ ظالموں کی ہم دردی میں مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ حضرت نوح کا ہلاک ہونے والا بیٹا یقیناً اہل میں سے نہ ہونے کے ساتھ ساتھ اہل ایمان میں سے بھی نہیں تھا، ورنہ دو میں سے کسی شرط کے پورا ہونے پر بچا لیا جاتا۔ لہٰذا، بیٹے سمیت ہلاک ہونے والے سب کے سب ظالم تھے، انھی کے بارے میں بات ہو رہی ہے کہ 'وَلَا تُخَاطِبْنِىْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا'، ''تم ظالموں کے بارے میں مجھ سے بات بھی نہ کرنا''۔ پچھلے کلام کے لیے اس میں تخصیص نام کی کوئی چیز اشارہ کی حد تک بھی موجود نہیں ہے۔ میری بات تو تب رد ہوتی کہ ہلاک ہونے والا بیٹا ظالموں میں سے نہ ہوتا، اور یہ جملہ بولا گیا ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ظالم بھی تھا اور بے نسب بھی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اور اگر تخصیص کے محل میں مان بھی لیں تو تب بھی یہ جملہ کشتی کے سواروں کی تخصیص نہیں کرتا۔ کشتی والوں کا بیانِ استثنا 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ' پر ختم ہو جاتا ہے۔ 'وَلَا تُخَاطِبْنِىْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' والا جملہ صرف یہ بتا رہا ہے کہ ہلاک ہونے والے سب ظالم ہی ہوں گے۔ یہ نہیں کہتا کہ بچنے والے ظالم نہیں ہوں گے۔ اگر جملہ یوں ہوتا کہ: 'اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ'، تو یقیناً تخصیص قائم ہو جاتی۔ یہاں تو جو جملہ ـــــ یعنی 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ' ـــــ ان کے استثنا کے لیے آ رہا ہے، وہ ایمان و کفر کی کسی چیز کا حامل نہیں ہے۔

۶۔ حضرت نوح کی بیوی کے خائن ہونے کے معنی کیا ہیں؟ میرے لیے یہ نہایت تکلیف دہ امر ہے کہ میں ان اولوالعزم اور جلیل القدر رسولوں کے بارے میں اس موضوع پر زور قلم صرف کروں۔ لیکن چونکہ یہاں استدلال درست استوار نہیں کیا گیا ہے، اس لیے اس کا تجزیہ ضروری ہے۔ یہاں صاحب مضمون نے زیادہ تر استدلال کے بجائے اپنے مزعومات کو پیش کیا ہے۔ ان سب کا ایک اصولی اور مختصر جواب تو یہ ہے کہ جب اللہ نے اسے خائن کہا

ہے تو میرا تو اس میں قصور نہیں ہے۔ وہ مزعومات جو معترض نے پیش کیے ہیں، کچھ ایسے ہیں: مثلاً یہ کہ حضرت نوح کو اللہ نے کیوں نہیں بتایا کہ ان کی بیوی بدچلن ہے، وہ عذاب تک ان کی بیوی کیوں رہی وغیرہ۔ محض خودساختہ باتیں ہیں[25]۔ خود جس معنی میں انھوں نے زوجۂ نوح کو خائن مانا ہے، یہ سب سوالات اس لحاظ سے بھی پیدا ہو جائیں گے۔ کہیں ان کی شدت کم اور کہیں زیادہ ہو جائے گی۔ البتہ ہمارے دوست نے یہ جو کہا ہے، اسے ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ:

> ''جہاں تک خیانت کا تعلق ہے، تو یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ محض یہ لفظ اُن کی عورت پر اتنا بڑا الزام لگا دینے کے لیے ہرگز صریح نہیں ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اصل میں امانت کے مقابلے میں آتا اور امین بنا دینے کے بعد کسی شخص پر جو اعتماد پیدا ہوتا ہے، اُس کے مجروح ہو جانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔... بدچلنی تو کسی صورت نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اس دعوے کے لیے جس درجے کا قرینہ چاہیے، وہ اشارے کی حد تک بھی کہیں کلام میں موجود نہیں ہے۔''
>
> (ماہنامہ ''اشراق'' نومبر ۲۰۱۸ء، ۵۲)

عمومی مستعمل معنی کے لیے قرائن فراہم کرنے کا مطالبہ غیر علمی تقاضا ہے۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ ''تھوڑی سی پیتا ہوں''۔ تو اس میں شراب نوشی کے لیے قرینہ کا مطالبہ نہایت تعجب کی بات ہوگی۔ عربی زبان کا یہ اسلوب واضح ہے کہ جب بھی کہا جائے کہ 'خانت بعلها' (اس نے شوہر سے خیانت کی)، اور یہ نہ بتایا جائے کہ خیانت کس معاملے[26] میں کی تو مراد صرف بدچلنی ہی ہوگی۔ جیسے ہماری اردو میں بے وفائی کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور انگریزی میں cheat her husband کا۔ آیت دیکھیے: '...امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا...' (التحریم ۶۶: ۱۰)، اس میں کسی اور معاملے کا ذکر نہیں ہے۔ بس شوہروں کے ساتھ خیانت کا ذکر ہے۔ جب سیدہ عائشہ پر نازیبا تہمت لگی، تو اس واقعہ کی روایات میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدہ کے بارے میں جو جملہ نبی کریم کو کہا، اس کے الفاظ یہ تھے: 'الَّتِي خَانَتْكَ، وَفَضَحَتْنِي'[27] (المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۶۳۸۹)۔ اسی طرح

۲۵؎ مثلاً اسی بات کو دیکھیں کہ وہ عذاب تک ان کی بیوی کیوں رہی؟ غیر ضروری سوال ہے؟ کہاں آیا ہے کہ وہ عذاب تک ساتھ ہی تھی، پھر کیسے معلوم ہوا کہ وہ دائمی خائن تھی؟ اور پھر کیسے معلوم ہوا کہ اللہ نے ان کو نہیں بتایا تھا، اور یہ کیسے معلوم ہوا کہ بتانے کے بعد بیٹے کے نسب پر لازماً سوال اٹھے گا۔ لہٰذا، اس طرح کی باتیں محض مزعومہ تصورات پر قائم ہیں۔ ان کی اس بحث میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جتنے سوال اٹھائے گئے ہیں، سب کی نوعیت ایسی ہی ہے۔ اگر استدلال کی کوئی قوت ان میں ہوتی تو میں ضرور جواب دیتا۔

۲۶؎ مثلاً 'خانت بعلها في العهد' (اس نے عہد میں شوہر سے خیانت کی)۔

۲۷؎ ''جس نے آپ سے خیانت کی ہے اور مجھے رسوا کیا ہے۔'' (میں صرف لسانی حوالے کے لیے لکھ رہا ہوں، صحتِ واقعہ زیر بحث نہیں)۔

بری بیوی کے اوصاف بتاتے ہوئے ایک حدیث کے الفاظ ہیں: 'وَامۡرَأَةٌ غَابَ زَوۡجُهَا وَقَدۡ كَفَاهَا مُؤۡنَةَ الدُّنۡيَا فَخَانَتۡهُ بَعۡدَهُ'[28] (ابن حبان، رقم ۴۵۵۹)۔ عباسی دور کے ایک شاعر ابن رومی کا شعر ہے:

خـانـت بــه أمُّـه أباهُ   فعينُه عينُها الخَؤونُ[29]

مختصر یہ کہ یہ اسلوب واضح اور دوٹوک ہے۔ آج بھی عربوں کے ہاں اس کے لیے با قاعدہ ایک اصطلاح: 'الخيانة الزوجية' استعمال ہوتی ہے۔ اس کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ میاں یا بیوی کا کسی غیر مرد و عورت سے تعلق رکھ کر اپنے جوڑے سے خیانت کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے معنی لینے کے لیے یہاں قرائن کی ضرورت ہے۔ اگر قرینے ہی کے پہلو سے بات کریں تو خیانت کی شوہر یا بیوی کی طرف نسبت ہی اس کا دوٹوک قرینہ ہے، جیسے یہاں 'فَخَانَتَاهُمَا' کے الفاظ سے بتایا گیا ہے۔ خیانت کرنے والی دو عورتیں ہیں جنھوں نے اپنے شوہروں کے نکاح میں ہوتے ہوئے خیانت کی۔ نکاح کا قرینہ فراہم کرنے کے لیے 'تَحۡتَ عَبۡدَيۡنِ' کے الفاظ آئے ہیں، وگرنہ کلام میں ان الفاظ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ اس زیر بحث مضمون میں، امانت کا ایک عجیب پہلو بھی بیان ہوا ہے کہ نوح اور لوط علیہما السلام کو بڑی امید تھی کہ ان کی بیویاں حق کو قبول کرتے ہوئے اپنے شوہروں کی مؤید و معاون بنیں گی، لیکن انھوں نے اس اعتماد کو ٹھیس پہنچائی (اشراق ۵۳)۔ اگر یہی امانت ہے تو پھر اسی سورہ میں اسی آیت کے فوراً بعد فرعون کی بیوی کا ذکر آیا ہے۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے کہ جو شوہر کی مؤید و معاون ہونے کے بجائے موسیٰ علیہ السلام کے دین پر آ گئی تھیں۔ اگر پہلی چیز شوہر کی خیانت ہے تو دوسری کیوں نہیں؟ ہے نہ طرفہ تماشا!

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا امۡرَاَتَ فِرۡعَوۡنَ اِذۡ قَالَتۡ رَبِّ ابۡنِ لِيۡ عِنۡدَكَ بَيۡتًا فِي الۡجَنَّةِ وَنَجِّنِيۡ مِنۡ فِرۡعَوۡنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ. (التحریم ۶۶:۱۱)

''اللہ ماننے والوں کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے، جب اُس نے دعا کی: پروردگار، میرے لیے جنت میں اپنے ہاں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اُس کے عمل سے نجات دے اور اِس ظالم قوم سے نجات عطا فرما۔''

---

[28] ''جس کا شوہر مفقود ہو جائے، اس حال میں کہ ضروریات زندگی جمع کر گیا ہو تو وہ اس کے پیچھے اس سے خیانت کرے۔''

[29] ''یہ، جس کی ماں نے اس کے حمل پر اس کے باپ سے خیانت کی، اب اس کی آنکھیں وہی ماں کی خیانت بھری آنکھیں ہیں''۔ (نوٹ یہ بہت بعد کا شعر ہے، اس لیے یہ صرف تائیدی طور پر پیش کر رہا ہوں۔)

۸۔حضرت نوح کا بیٹا انھی کی صلب سے تھا، کو ثابت کرتے ہوئے ہمارے دوست نے ایک اور دلیل دی ہے۔ کہتے ہیں کہ ''خداے علام نے کسی اور کی زبان سے نہیں، بلکہ اپنی طرف سے تبصرہ کرتے ہوئے اسے نوح کا بیٹا قرار دیا ہے۔فرمایا ہے: '...وَنَادٰی نُوْحُ نِ ابْنَہٗ' (ہود ۱۱: ۴۲)''۔ یہ استدلال درست نہیں۔واضح رہے کہ ''اپنی طرف سے تبصرہ کرنے''[۳۰] اور ''حکایت کرنے'' میں بہت فرق ہوتا ہے۔مندرجہ بالا جملے میں اللہ کا تبصرہ تو کہیں نہیں ہے، البتہ، جو حضرت نوح نے کیا، اللہ تعالیٰ اسے حکایت کر رہے ہیں۔حضرت نوح نے اپنے بیٹے ہی کو پکارا تھا۔وہ اللہ کی اطلاع سے پہلے اسے اپنا بیٹا ہی سمجھتے تھے۔توضیح بات یہ ہے کہ یہ اللہ کا تبصرہ ہرگز نہیں ہے، محض حکایتِ ماجرا ہے۔اس سے یہ دلیل ہرگز نہیں نکالی جا سکتی، جو ہمارے دوست نے برآمد کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہاں، اس صورت میں کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ اللہ نے اس کی تردید نہیں کی، تو اس لیے اس کے حقیقت ہونے کا امکان ہے۔لیکن قسمت سے یہاں اس کی تردید بھی کلام میں موجود ہے۔حضرت نوح کے اپنے بیٹے کو پکارنے کی حکایت بیالیسویں[۳۱] آیت میں ہے اور چھیالیسویں آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تردید آ گئی ہے۔اس مقام پر نگاہ ڈال لیجیے۔ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف تردید والی چھیالیسویں آیت ہی اقتباس کر رہے ہیں:

قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَالَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ اِنِّیْٓ اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ. (ہود ۱۱: ۴۶)	''فرمایا: اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ نہایت نابکار ہے۔سو مجھ سے اُس چیز کے بارے میں سوال نہ کرو جس کا تجھے کچھ علم نہیں ہے۔میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔'' (ترجمہ از البیان)

اس پر آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکایتِ ماجرا کی مجبوری ہے کہ اس ناخلف کو حضرت نوح کا بیٹا کہہ کر ہی ذکر کیا جائے گا، اس لیے کہ اسے بیٹا کہے بغیر حکایت ممکن ہی نہیں ہے۔جو بات کہنا پیش نظر ہے، اس کے لیے اسے 'بیٹا' کے لفظ کا حوالہ دیا جانا ضروری ہے۔میں اپنے پورے مضمون میں اس کے باوجود کہ اسے نوح علیہ السلام کا بیٹا

۳۰؎ یہ تعبیر صریح نہیں، لیکن مجانست کے اسلوب پر اسی کو اختیار کر رہا ہوں۔

۳۱؎ یہ آیت یوں ہے:

...وَنَادٰی نُوْحُ نِ ابْنَہٗ وَکَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا وَلَا تَکُنْ مَّعَ الْکٰفِرِیْنَ. (ہود ۱۱: ۴۲)

''...اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی، جو (کچھ فاصلے پر اُس سے) الگ تھا، بیٹا: ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور اِن منکروں کے ساتھ نہ رہو۔'' (ترجمہ از البیان)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نہیں مانتا، مگر لکھنا یہی پڑا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے حقیقت کے خلاف ہونے کے باوجود لکھنا یہی پڑے گا کہ بقول نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ وہ واقعہ جو ان آیات میں بیان ہوا ہے، وہ اسے بیٹا کہے بغیر بیان کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ واقعہ جب وقوع پذیر ہو رہا تھا تو حضرت نوح اس سے بیٹے ہی کی طرح معاملات کر رہے تھے۔ ایک موٹی سی مثال دیکھیں: اگر پہلے 'وَنَادٰی نُوْحُ ۨ ابْنَهٗ' حکایت نہ کیا جائے تو حضرت نوح کا یہ جملہ آیا حکایت کیا جا سکے گا کہ 'یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا'؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔

حکایت اور تبصرہ کے فرق کو نہ سمجھنے ہی کی وجہ سے لوگ قرآن پر اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کا مصنف یہ مانتا ہے کہ زمین پر ہی سورج کے غروب ہونے کی ایک جگہ ہے، وہاں سیاہ کیچڑ کا ایک چشمہ ہے، اور واقعتاً سورج روزانہ اس چشمہ میں جا ڈوبتا ہے۔ قرآن کا یہ مقام یوں ہے:

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ.... (الکہف ۱۸:۸۶)

''یہاں تک کہ جب ذوالقرنین سورج کے غروب ہونے کی جگہ تک پہنچا تو اُس نے سورج کو دیکھا کہ ایک سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈوب رہا ہے....'' (ترجمہ از البیان)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کیا خیال ہے، اسے بھی اللہ کا تبصرہ نہ سمجھ لیا جائے، اور مان لیا جائے کہ واقعی سورج زمین پر ہی کسی جگہ غروب ہوتا ہے اور واقعتاً وہاں سیاہ کیچڑ کا ایک چشمہ ہے جس میں وہ ہر شام کو ڈوبتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ماننا ممکن نہیں ہے، حالاں کہ اس کی تردید بھی نہیں آئی، اس لیے ضروری ہے کہ حکایت اور تبصرۂ الٰہی میں فرق ملحوظ رکھا جائے، وگرنہ کئی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

یہ ہمارے اس عزیز دوست کا نقد تھا جس نے حال ہی میں قرآن کے گہرے مطالعے کا کام بڑی جاں فشانی سے مکمل کیا ہے، 'بارك الله فیه'۔ لہٰذا، توقع یہی ہے کہ قرآن کے تمام مقامات جو اس موضوع پر پیش کیے جا سکتے تھے، سامنے آ گئے ہوں گے۔ اپنے دوست کی اس گراں قدر خدمت پر ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس نقد کے جائزے کے بعد اب میں مزید تسلی کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن کے واضح بیانات کے مطابق بنی اسرائیل حضرت نوح علیہ السلام کی نہیں، بلکہ ان کے کسی ساتھی کی نسل سے ہیں۔ لہٰذا، حضرت ابراہیم حضرت نوح کے خانوادے سے نہیں، بلکہ نوح علیہما السلام کے ساتھی 'عَبْدًا شَکُوْرًا' کی اولاد سے ہیں۔ دنیا میں حضرتِ نوح ہی کی نہیں، کئی اور نسلیں بھی آباد ہیں، اور یہ کہ حضرت نوح کا بیٹا، ان کے اہل خانہ میں سے نہیں تھا۔ و العلم عند اللّٰہ۔

اشاریہ

نعیم احمد

اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۱۸ء

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآنیات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	البیان: مریم ۱۹: ۱۶-۴۰ (۲)	جاوید احمد غامدی	۱۹
فروری	البیان: مریم ۱۹: ۴۱-۶۳ (۳)	〃	۱۳
مارچ	البیان: مریم ۱۹: ۶۴-۹۸ (۴)	〃	۱۳
اپریل	البیان: طٰہٰ ۲۰: ۱-۸ (۱)	〃	۸
مئی	البیان: طٰہٰ ۲۰: ۹-۴۱ (۲)	〃	۱۱
جون	البیان: طٰہٰ ۲۰: ۴۲-۹۸ (۳)	〃	۹
جولائی	البیان: طٰہٰ ۲۰: ۹۹-۱۳۵ (۴)	〃	۶
اگست	البیان: الانبیاء ۲۱: ۱-۳۳ (۱)	〃	۱۴
ستمبر	البیان: الانبیاء ۲۱: ۳۴-۷۷ (۲)	〃	۱۵
اکتوبر	البیان: الانبیاء ۲۱: ۷۸-۹۴ (۳)	〃	۱۱
نومبر	البیان: الانبیاء ۲۱: ۹۵-۱۱۲ (۴)	〃	۱۰
دسمبر	البیان: الحج ۲۲: ۱-۴ (۱)	〃	۹

معارف نبوی

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	اتمام حجت اور عذاب (۱)	جاوید احمد غامدی/ محمد حسن الیاس	۲۷
〃	تصاویر اور نماز میں خلل	جاوید احمد غامدی/ محمد عامر گزدر	۳۵
فروری	اتمام حجت اور عذاب (۲)	جاوید احمد غامدی/ محمد حسن الیاس	۲۲
〃	زینتوں سے پرہیز	جاوید احمد غامدی/ محمد عامر گزدر	۳۲
مارچ	بالوں کو رنگنا	〃	۲۴
اپریل	اتمام حجت اور عذاب (۳)	جاوید احمد غامدی/ محمد حسن الیاس	۱۲
〃	فرشتے، تصاویر اور کتا	جاوید احمد غامدی/ محمد عامر گزدر	۲۲
جولائی	دین اور اخلاق	جاوید احمد غامدی/ محمد حسن الیاس	۲۰
〃	تصویر اور مصوری	جاوید احمد غامدی/ محمد عامر گزدر	۲۷
اگست	اسلام اور فطرت	جاوید احمد غامدی/ محمد حسن الیاس	۲۵
اکتوبر	اخلاقیات	〃	۲۳
نومبر	ایمان کا ایک تقاضا	〃	۱۷
دسمبر	اخلاقیات (۳)	〃	۱۳

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دین ودانش

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
مئی	روزہ اور برکات روزہ	مولانا امین احسن اصلاحی	۲۵
جون	آفات روزہ اور ان کا علاج	؍	۳۲
؍	رمضان، عبادات اور للہیت	ساجد حمید	۳۸

شذرات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	حدیث وسنت کی اصطلاحات: جناب جاوید احمد غامدی کا موقف	سید منظور الحسن	۴
فروری	زنا بالجبر کی سزا کے بارے میں فقہا کا موقف (۱)	؍	۴
مارچ	زنا بالجبر کی سزا کے بارے میں فقہا کا موقف (۲)	؍	۴
اپریل	اسلاف کے کام کے بارے میں صحیح علمی رویہ: غامدی صاحب کی ایک گفتگو کا خلاصہ	؍	۴
مئی	روزہ	جاوید احمد غامدی	۴
؍	علم کا سفر	سید منظور الحسن	۷
جون	روزے کا مقصد	جاوید احمد غامدی	۴
؍	سورۂ توبہ میں ’اَلَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ‘ سے مراد	سید منظور الحسن	۶
جولائی	پارلیمنٹ کی بالادستی	جاوید احمد غامدی	۴
اگست	قربانی	؍	۴
؍	اسلام کا منشا: جمہوریت یا آمریت	سید منظور الحسن	۱۰
ستمبر	حدیث وسنت کی حجیت: مدرسۂ فراہی کے موقف کا تقابلی جائزہ	؍	۴
اکتوبر	ڈپریشن ـــــ اسباب اور علاج (۱) جناب جاوید احمد غامدی سے ایک گفتگو	؍	۴
نومبر	ماخذ دین کی بحث: جناب جاوید احمد غامدی سے ایک گفتگو (۱)	؍	۴

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
دسمبر	''الرسالہ'' میں ماخذ دین کی بحث: جناب جاوید احمد غامدی سے ایک گفتگو (۲)	سید منظور الحسن	۴

نقطۂ نظر

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
مارچ	حرمت سود: چند نکات	ڈاکٹر محمد اقبال قریشی	۹۶
اپریل	کیسے اللہ والے ہیں یہ اے خدا!	ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۷۵
مئی	کیا جاوید احمد غامدی امت مسلمہ کی اکثریت کی تکفیر کرتے ہیں؟	″	۷۴
ستمبر	اقدامِ حسین: اسوۂ انبیا کی روشنی میں	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۵۵
″	اسلام اور تبدیلی مذہب کا مسئلہ: بعض نئے مطالعات کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۷۰

نقد و نظر

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
فروری	اگر زینب زندہ ہوتی	محمد حسن الیاس	۷۰
″	زنا بالجبر، حنفی فقہ اور امام سرخسی	″	۷۴
″	فقہ کی عدالت میں نابالغ بچی کے ساتھ ریپ کی سزا	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۷۸
مئی	قصر نماز	محمد حسن الیاس	۶۹
نومبر	'جدید' مسلم	طالب محسن	۵۸
″	قربانی سے پہلے بال اور ناخن نہ کاٹنا	محمد حسن الیاس	۶۴
دسمبر	نوح اور ابراہیم: نقدِ احباب کا جائزہ	ساجد حمید	۶۶

سیر و سوانح

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۱)	محمد وسیم اختر مفتی	۳۹

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
فروری	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۲)	محمد وسیم اختر مفتی	۴۴
مارچ	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۳)	"	۳۸
اپریل	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۴)	"	۴۷
مئی	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۵)	"	۳۴
جون	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۶)	"	۴۵
جولائی	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۷)	"	۶۴
اگست	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۸)	"	۳۰
ستمبر	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۹)	"	۲۷
اکتوبر	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۱۰)	"	۳۲
نومبر	ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۱۱)	"	۲۶
دسمبر	حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا	"	۲۰

مقالات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	مقدرات کے مبنیٰ و معاونین	ساجد حمید	۴۵
فروری	مدعائے متکلم اور الفاظ کی اہمیت	"	۵۲
مارچ	تکفیر	رضوان اللہ	۴۴
اپریل	قرآن میں تقویت دلالت کا اضافی اہتمام	ساجد حمید	۵۷
مئی	حضرت موسیٰ اور حضرت عمر کی شخصی و فکری مماثلتیں	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۴۵
"	مطلقہ اور بیوہ کی عدت: ایک جائزہ	"	۵۶
"	قبیلائی تعصّبات: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں	محمد تہامی بشر علوی	۶۰
جون	زکوٰۃ: ایک مطالعہ نو؛ فقہی قیود اور ان کے نتائج	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۵۷
اگست	تعدد معنی اور دلالت لسانی	ساجد حمید	۳۶

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
اگست	احمدیت کی اشاعت اور بنیادی استدلالات کا مختصر جائزہ	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۴۸
ستمبر	ابراہیم ذریت نوح نہیں (علیہما السلام): قرآن کا ایک انکشاف	ساجد حمید	۴۳
اکتوبر	البیان: خصائص و امتیازات (۱)	رضوان اللہ	۴۴
نومبر	واقعۂ نوح	؍	۴۳
دسمبر	البیان: خصائص و امتیازات (۲)	؍	۳۴

مختارات

جنوری	علم و دعوت کا توازن	محمد ذکوان ندوی	۵۵

اصلاح و دعوت

جولائی	ذوق تجسس	محمد تہامی بشر علوی	۷۹
اگست	تذکیر بالقرآن	محمد ذکوان ندوی	۸۰
اکتوبر	تفسیر اور تذکیر کا فرق	؍	۷۲
؍	تنقیدی شعور	خورشید احمد ندیم	۷۹

تبصرۂ کتب

جنوری	ناول: خدا بول رہا ہے	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۷۵
جون	''درِادراک''	؍	۷۸
؍	''درِادراک'': ایک علمی و اصلاحی کاوش	شاہد رضا	۸۱

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

Trusted Name for Last 65 years

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949
Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk
Tel: 021-38682810

Monthly
ISHRAQ
Lahore

Dec 2018
Vol.30 No.12
Regd No.CPL-183

Publisher : javed Ahmad Ghamidi printers : Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

لئن شکرتم لازیدنکم
اگر شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا (القرآن)

PRAISE BE TO ALLAH, LORD OF THE WORLDS

150+ within 250 days
keep counting...

ALLIED SCHOOLS
Project of Punjab Group of Colleges

Allied Pre School
Allied School

Growing Together

Ar-Rahman Campus-JHELUM
Outside Classroom Education
Inter-Campus Transfer
Sahi Campus-SHAHKOT
Al-Fajar Campus-LAHORE
Ghazi Campus-OKARA
Rehman Campus-GUJRANWALA
Pak Campus-LAHORE
Web Portal
Parent-Teacher Meetings
Harbanspura Classic Campus-LAHORE
Sialkot Campus-SIALKOT
Al-Miraj Campus-LAHORE
Sibling Discount
Sir Syed Campus-LAHORE
Capital Campus-ISLAMABAD
Ellahabad Campus-ELLAHABAD
Cantt Campus-GUJRANWALA
Ferozpur Road Campus-LAHORE
Raiwind Road Campus-LAHORE
Sargodha Road Campus-FAISALABAD
Farooqabad Campus-FAROOQABAD
Jhelum Campus-JHELUM
Marrium Campus-JOHARABAD
Spoken English
Character Building
Grace Campus-LAHORE
Gojra Campus-GOJRA
Lodhran Campus-LODHRAN
Bhimber Campus-BHIMBER
Shakargarh Campus-SHAKARGARH
Standardized Curriculum
Shalimar Campus-FAISALABAD
Sahiwal Campus-SAHIWAL
Entry Test Preparation
DC Road Campus-GUJRANWALA
Ali Pur Chattah Campus-ALI PUR CHATTAH
Al-Ahmad Campus-LAHORE
Bahawalpur Campus-BAHAWALPUR
Mock Assessment
Educational Insurance
Tulip Campus-LAHORE
Satellite Town Campus-GUJRANWALA
Bilal Campus-BHALWAL
Professional Development of Teachers
Zafarwal Campus-ZAFARWAL
Attendance by SMS
Concept-Based Teaching
Wapda Town Campus-GUJRANWALA
Exclusive Early Years Education
Burewala Campus-BUREWALA
Husnain Campus-SAMBRIAL
Bedian Campus-LAHORE
Peshawar Road Campus-RAWALPINDI
Gulshan-e-Ravi Campus-LAHORE
Samanabad Campus-LAHORE
Sadar Campus-LAHORE
Samanabad Campus-FAISALABAD
Kamoke Campus-KAMOKE
Chauburji Campus-LAHORE
Peoples Colony Campus-FAISALABAD
Hafizabad Campus-HAFIZABAD
Wazirabad Campus-WAZIRABAD
Subhan Campus-PATTOKI
PECO Road Campus-LAHORE
Allama Iqbal Town Campus-LAHORE
International Standards
Peoples Colony Campus-GUJRANWALA
Al-Fatah Campus-KOT ABDUL MALIK
Dinga Campus-DINGA
Thana Campus-MALAKAND AGENCY
Faisalabad Campus-FAISALABAD
Lalamusa Campus-LALAMUSA
Madina Campus-FAISALABAD
Teaching through Animation
Oasis Campus-BAHAWALPUR
Taunsa Campus-TAUNSA SHARIF
Mumtaz Campus-MULTAN
Health & Hygiene Guidance
Rahim Yar Khan Campus-RAHIM YAR KHAN
Narowal Campus-NAROWAL
Jalal Pur Jattan Campus-JALAL PUR JATTAN
Bakhtiyari Campus-LAHORE
Malakwal Campus-MALAKWAL
DG Khan Campus-DERA GHAZI KHAN
Gujrat Campus (South)-GUJRAT
Mirpur Campus-MIRPUR AZAD KASHMIR
Quaid Campus-TOBA TEK SINGH
Model Town Campus-GUJRANWALA
Mouaz Campus-MANANWALA
Al-Ghaffar Campus-SARA-E-ALAMGIR
Bhakkar Campus-BHAKKAR
Qila Didar Singh Campus-QILA DIDAR SINGH
Zaimas Campus-SHEIKHUPURA
Satellite Town Campus-RAWALPINDI
GT Road Campus-GUJRANWALA
Kamalia Campus-KAMALIA
Extra & Co-curricular Activities
Ar-Raheem Campus-DINA
Walton Campus-LAHORE
Johar Town Campus (South)-LAHORE
Merit Scholarships
Career-Path Counseling
Akbar Campus-VEHARI
Hyderabad Campus-HYDERABAD
Sargodha Campus-SARGODHA
Dunyapur Campus-DUNYAPUR
Chichawatni Campus-CHICHAWATNI
Art, Craft & Music
Kasur Campus-KASUR
Johar Town Campus (North)-LAHORE
Ahmed Campus-RAHIM YAR KHAN
Swat Campus-SWAT
Satellite Campus-RAWALPINDI
Fatima Campus-DASKA
Adyala Campus-RAWALPINDI
English Medium
Sadiqabad Campus-SADIQABAD
Playgroup to University Education
Mandi Bahauddin Campus-MANDI BAHAUDDIN
Chenab Campus-PARHIANWALI
Hujra Shah Muqeem Campus-HUJRA SHAH MUQEEM

Group Corporate Office, Allied Schools & Punjab Colleges, 64-E-I, Gulberg III, Lahore - Pakistan. Ph: 042 35756357-58.
www.alliedschools.edu.pk